وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جون ۱۹۸۰ء

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن - لاہور

(فون : 852611 - 852683)

چندہ سالانہ -/۲۰ —— قیمت فی شمارہ -/۲

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ میثاق لاہور

عدد ٦	جون ١٩٨٠ء	جلد ٢٩

مشمولات

★ تذکرہ وتبصرہ :
اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند . . ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ١

★ نشر القرآن :
درس قرآن پر مشتمل نشری تقاریر . . ڈاکٹر اسرار احمد " ٩

★ درس حدیث :
الحب للہ والبغض للہ . . . . مولانا محمد حسین میر " ١٧

★ مقالہ :
اسلامی سن کی ابتداء . . . . مولانا محمد امین اثری " ٢١

★ سلسلہ تقاریر سیرت (٧)
'الفتنۃ الکبری' . . . . ڈاکٹر اسرار احمد " ٢٥

★ رفتار کار :
مختصر رو داد ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس . . . . . .
قاضی عبدالقادر " ٤١
سالانہ اجلاس عام مرکزی انجمن خدام القرآن . . . . .
چوہدری نصیر احمد ورک " ٥٢

★ افکار و آراء :
جناب 'م ـ ش' کا اعتراف حقیقت . . . قاضی عبدالقادر " ٥٥

پبلشر : ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع : رشید احمد چوہدری

مطبع : مکتبہ جدید پریس ، شارع فاطمہ جناح ، لاہور

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

الحمد للہ ثم الحمد للہ! کہ اِن سطور کا ناچیز راقم نہ دیوبندی ہے نہ بریلوی، بلکہ عام متداول معنوں میں نہ حنفی ہے نہ اہلِ حدیث بلکہ بفحوائے الفاظ قرآنی : ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا (الحج) اور وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ٥ (حٰم السجدہ) صرف اور صرف مسلمان ہے اور اس کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ : وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥ (البقرہ) اور تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ٥ (یوسف) کے مصداق اللہ تعالیٰ اسلام پر ہی خاتمہ بالخیر فرمادے اور آخرت میں خالصتہً اپنے فضل وکرم سے اپنے نیک بندوں کے ساتھ شامل فرمادے! — وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ط

اس کے یہ معنیٰ بہر حال نہیں ہیں کہ راقم موجودہ مختلف مسلمان جماعتوں اور گروہوں (فرقوں کا لفظ طبیعت پر گراں گذرتا ہے!) کی دینی خدمات یا اُن کے اعاظم و اکابر کے دینی مرتبہ و مقام کا منکر ہے۔ ماضی میں جماعتِ اہل حدیث نے ابطالِ شرک اور ردِّ بدعات کے ضمن میں جس مجاہدانہ کردار کا مظاہرہ کیا ہے راقم اس کا معترف ہی نہیں تہِ دل سے قدر دان ہے۔ اگرچہ اس کے نزدیک اب اہلِ حدیث حضرات بھی 'جماعت' نہیں رہے بلکہ 'فرقہ' بن گئے ہیں۔ اسی طرح دار العلوم دیوبند جس طرح صنم خانۂ ہند میں قال اللہ تعالیٰ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم مرکز اور جہادِ حریت و استخلاصِ وطن کا اہم مورچہ بنا اس کا بھی ایک نہایت گہرا نقش راقم کے لوحِ قلب پر کندہ ہے اور اُس کے مؤسسین و اکابر کے خلوص و اخلاص اور تقویٰ و تدیّن اور ان کی عظمتِ کردار کے تصوّر ہی سے راقم کا سر بے اختیار جھک جاتا ہے: ع

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!"

یہی وجہ ہے کہ راقم کے قلم سے جون ۱۹۶۲ء کے 'میثاق' میں جو مفصل مضمون

شائع ہوا تھا (جو بعد میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام!" کے نام سے طبع ہوا اور گویا مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا MANIFESTO بن گیا!) اس میں ہندوستان میں انگریزی استعمار اور مغربی تہذیب کے خلاف مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل" کے عنوان سے یہ الفاظ موجود ہیں:

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحاب کہف کی سنت کا اتباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نفی فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالم اسلام میں نہیں ہے لہذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے، اور ہر طرح کے طعن و استہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امت کے ایک حصے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— ! اس قسم کی کوشش کا مظہر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعۃً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ——— !

پھر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں "اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کی کش مکش کے دو دور!" کے ضمن میں "دورِ ثانی" سے بحث کرتے ہوئے سرسید مکتبِ فکر کی "عقلیتِ جدیدہ" کے بعد راقم نے لکھا:

متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا۔ جس نے قال اللہ و قال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا اور اس قول میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ و دارالعلوم ہی نہیں ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کی حفاظت کا موثر دل ادا کیا اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے۔ چنانچہ شیخ الہند

مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہدِ حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملّت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی و روحانی، مذہبی و سیاسی اور دعوتی و تبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ اوپر ہی کی مثال کیمطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی و مذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس و میلاد اور فاتحہ و درود تک محدود ہے بقیہ تمام فعّال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق و منسلک ہیں۔

بات چل ہی نکلی ہے تو اس ذکر میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ ستمبر، اکتوبر ۷۵ء کے 'میثاق' میں راقم کے قلم سے پورے دس صفحات پر پھیلی ہوئی تحریر شائع ہوئی (از ص۱۵ تا ص۲۴) جس کا پورا تانا بانا حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیّت کی عظمت کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے جن کی بنا پر راقم کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ کم از کم برّ صغیر ہند و پاک کی حد تک چودھویں صدی ہجری کے اصل مجدّد آں محترم ہی تھے!

دارالعلوم دیوبند اور اُس کے اکابر کے ساتھ اسی قلبی تعلق کا نتیجہ تھا کہ جیسے ہی سننے میں آیا کہ صد سالہ اجلاس (جشن ؟) منعقد ہو رہا ہے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس میں شرکت کی جائے۔ لیکن پھر اس خیال نے خواہش کو دبا دیا کہ تم نہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التّحصیل نہ اس کے انتظام و اہتمام کے ذمّہ دار حضرات سے تمہاری کوئی راہ و رسم —— آخر شرکت ہو تو کس بنیاد پر —!!

اسی اثناء میں (فروری ۱۹۸۰ء میں) اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور رفیقِ مکرّم قاضی عبدالقادر صاحب کی مستعدی کی بناء پر ہندوستان کا سفر ہو گیا۔ اور ۱۲ فروری کو رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ رحؒ کی حاضری اور حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے طویل اور بے تکلّف ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس موقع پر بعض دوسرے نہایت قیمتی مشوروں کے ساتھ حضرت مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ: تم دارالعلوم کے اجلاس میں ضرور شرکت کرو! میں نے عرض کیا حضرت! میں وہاں کس

حیثیت سے جاؤں، وہاں کی شمولیت کے دعوت نامے تو صرف فارغ التحصیل حضرات کو بھیجے گئے ہیں۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ اس کی فکر تم مت کرو، دعوت نامہ پہنچ جائے گا۔ میں نے مزید ہمت کر کے عرض کیا کہ حضرت ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ وہاں میرا قیام آپ کے ساتھ رہے، اس لئے کہ میرا کسی سے تعارف نہیں ہے۔ یہ میں کہنے کو تو کہہ بیٹھا لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ "ایاز قدرِ خود بشناس!" یہ کچھ زیادہ ہی جسارت ہے، لیکن ع "اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارائیں!" کے مصداق اُدھر سے اس کی بھی منظوری ہو گئی ـــــ تو معاً خیال آیا کہ شاید اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص ہی حکمت پوشیدہ ہے ـــــ اگلے روز لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی اس کی پوری شدّ و مدّ سے تائید کی اور چونکہ وہ نہ صرف دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے بلکہ اجلاسِ صد سالہ کی منتظمہ میں بھی شریک تھے، لہٰذا انہوں نے دیوبند فوراً خط لکھ دیا کہ اس عاجز کے نام دعوت نامہ ارسال کر دیا جائے۔

پاکستان واپس آیا تو طویل غیر حاضری کی باعث کاموں کا انبار جمع ملا اور ان میں کچھ ایسا مصروف ہوا کہ بظاہر فوراً ہی ایک اور غیر ملکی سفر ناممکن سا نظر آیا۔ اوّل اوّل تو اس خیال سے اطمینان سا ہو جاتا رہا کہ پتہ نہیں دعوت نامہ آتا بھی ہے یا نہیں؟ لیکن جب وہ بھی موصول ہو گیا تو ایک جانب ایفائے وعدہ کی فکر دامنگیر ہوئی اور دوسری جانب اپنی معمول کی مصروفیات اور ان پر مستزاد ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس اور انجمن کے سالانہ اجلاسِ عام کے معاملے گھیراؤ کئے نظر آئے۔ میں اسی کش مکش میں تھا کہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے مہتمم مولانا عبید اللہ صاحب کی جانب سے ویزا کی درخواستوں کے ضمن میں جس آخری تاریخ کا اعلان کیا گیا تھا وہ گذر گئی۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ "وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ!" کیسی اٹل حقیقت ہے، یہ ہم ہی ہیں جو "وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ" کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ اعلان شدہ تاریخ گذر چکی تھی اور میں گیارہ بجے کی پرواز سے کراچی جانے والا تھا کہ نو بجے کے لگ بھگ دل میں شدید ندامت کا احساس ہوا کہ مولانا علی میاں مدّ ظلّہٗ نے کیسی محبت بھری دعوت دی، پھر مولانا نعمانی مدّ ظلّہٗ نے دعوت نامہ بھی بھجوا دیا ـــــ اور تم ہو کہ پھر بھی نہیں جا رہے ـــــ!! ـــــ میں نے فوراً جامعہ اشرفیہ

فیروزپور روڈ فون کیا لیکن مولانا عبیداللہ صاحب سے رابطہ نہ ہوسکا۔ پھر اُن کے چھوٹے بھائی مولانا فضل رحیم صاحب کو نیلہ گنبد فون کیا۔ اللہ کا کرنا کہ وہ مل گئے اور جب میں نے مدعا بیان کیا تو وہ سراپا تواضع بن گئے اور انہوں نے میرے ارادۂ سفر پر حد درجہ مسرّت کا اظہار کیا۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ابھی دو گھنٹے بعد بڑے بھائی صاحب (مولانا عبیداللہ صاحب) ویزا کی تمام درخواستیں لے کر اسلام آباد جا رہے ہیں آپ پاسپورٹ اور فوٹو وغیرہ ایئرپورٹ پر ہی لے آئیں۔ چنانچہ میں بھاگتا دوڑتا گھر سے روانہ ہوا۔ راستے میں "ایک منٹ میں تین فوٹو!" والوں سے فوٹو کھنچوایا اور ایئرپورٹ پہنچا۔۔۔ وہاں عجیب پریشانی ہوئی، میری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو گیا اور وہاں نہ مولانا عبیداللہ نظر آئے نہ مولانا فضل رحیم۔۔۔ اسی کشمکش میں تھا کہ اندر جاؤں یا مزید انتظار کروں کہ مولانا عبیداللہ داخل ہوتے نظر آئے، دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔۔۔ اور جلدی سے اپنا پاسپورٹ، فوٹو اور فیس ویزا وغیرہ کے لئے ڈیڑھ صد روپے ان کے حوالے کئے اور ویزا کی درخواست پر اپنے دستخط کرنے کا 'مختار نامہ' زبانی انہیں دیا اور بھاگتا ہوا اپنے ہوائی جہاز کی جانب روانہ ہو گیا۔

ابھی ایک خیال یہ باقی تھا کہ چونکہ میں ایک ماہ قبل ہی ہندوستان ہو آیا تھا لہٰذا شاید کہ ہندوستان کے سفارت خانے والے اعتراض کر دیں۔ لیکن مشیّتِ ایزدی نے سارے مراحل طے کرا دیئے۔۔۔ اور ۱۹ر مارچ کو ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے لاہور سے دیوبند کے لئے روانگی ہو گئی۔۔۔ اسی ٹرین میں حلقۂ دیوبند کے بہت سے اکابر علماء اور اعاظم صلحاء موجود تھے۔۔۔ اور آٹھ سو یا ایک ہزار کے لگ بھگ نفری میں سے باقی سبھی مجھ سے تو بہرحال اعلم بھی تھے اور افضل بھی۔ ایسے اصحابِ علم و فضل کی "ہم سفری" بجائے خود بہت دلخوش کن اور سرور آمیز تھی۔۔۔ اس لئے کہ اپنا تو حال وہی ہے کہ:

أُحبّ الصّالحين ولستُ منهم ۞ لعلّ اللّٰه يرزقني صلاحًا

دینی جماعتوں اور گروہوں میں سے اجتماعات اور اجتماعی معاملات میں سلیقہ نظم و ضبط اور حسنِ انتظام و انصرام کی اعلیٰ ترین مثالیں تو اس دور میں غالباً جماعتِ اسلامی ہی نے قائم کی ہیں۔ تبلیغی جماعت کے اجتماعات اگرچہ ویسے آراستہ و

پیراستہ، تو نہیں ہوتے اور بظاہر وہاں درویشانہ بے قاعدگی ہی کا دور دورہ نظر آتا ہے تاہم وہاں انسان تھوڑی دیر ٹھہرے تو بخوبی اندازہ کرلیتا ہے کہ اس ماحول میں ایک مضبوط نظم کا تانا بانا موجود ہے اگرچہ ہے وہ: "بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" کی قسم کا کہ اُس کے کاغذی یا دفتری قسم کے لوازم کہیں نظر نہیں آتے۔ رہا تبلیغی جماعتوں کے سفر یا گشت کا معاملہ تو وہ تو حد درجہ منظم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے گروپ کا بھی حسبِ ارشادِ نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام ایک امیر مقرر ہوتا ہے اور تمام شرکاء اس کی اطاعت بدل وجان کرتے ہیں۔ چونکہ تبلیغی جماعت ہمارے نزدیک حلقۂ دیوبند ہی کی ایک شاخ ہے لہٰذا توقع تھی کہ اس سفر اور اجلاس کے دوران بھی نظم وضبط اور حُسنِ انتظام کا وہی نقشہ نظر آئے گا لیکن افسوس کہ صورت بالکل ہی مختلف بلکہ متضاد سامنے آئی۔

اس بدنظمی کا اوّلین مظاہرہ تو لاہور ریلوے اسٹیشن ہی پر ہوگیا تھا جہاں پاسپورٹوں کا حصول ہی ع: "لانا ہے جوئے شیر کا!" کا مصداق بن گیا۔ وہ تو خدا بھلا کرے جج آفس نیلا گنبد والے حاجی افضل صاحب کا کہ وہ راقم کے کرم فرما ہیں اور سررشتہ پاسپورٹ سے وہ بھی کسی حیثیت سے منسلک تھے، ورنہ مجھ ایسے کمزور وناتواں انسان کے لئے تو یہ مرحلہ ہی ناقابلِ عبور ہوجاتا۔ پھر چونکہ صرف اس قافلے کے لئے ایک سپیشل ٹرین جاری تھی اس لئے خیال تھا کہ گاڑی میں نشستیں باقاعدہ الاٹ ہوں گی۔ لیکن جب ایسا نہ ہوا تو دل کو تسلی دی کہ غالباً جو ٹرین اٹاری سے ملے گی اس میں اس کا اہتمام ہوگا۔ لیکن اٹاری میں امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کے مراحل طے ہونے کے بعد جب گاڑی میں سوار ہونے کا وقت آیا تو پھر وہی افراتفری نظر آئی — بلکہ سارے مراحل طے ہوجانے کے بعد بھی گاڑی لگ بھگ دو گھنٹے اس لئے کھڑی رہی کہ ریلوے کے ٹکٹوں کے پیسے پورے نہیں ہو رہے تھے۔ اس تاخیر کا اضافی نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور سے روزانہ کے معمول کے مطابق آنے والی گاڑی بھی آگئی اور اس کے بھی بہت سے مسافر اسی "سپیشل ٹرین" میں سوار ہوگئے گویا گھمسان شدید سے شدید تر ہوگیا۔ اللہ اللہ کر کے گاڑی چلی اور رات بھر سفر کرکے علی الصّبح دیوبند ریلوے اسٹیشن سے دو ڈھائی میل ورے عارضی طور پر تیار کئے ہوئے "دارالعلوم ہالٹ" پر رک گئی تو اصل بدنظمی سامنے آئی۔

'اجلاسِ صد سالہ' کے لئے جو وسیع و عریض پنڈال بنایا گیا تھا وہ دیوبند سے سہارنپور کی جانب ڈھائی تین میل کے فاصلے پر ریلوے لائن سے بالکل متصل واقع تھا اور عارضی 'دارالعلوم ہالٹ' کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی تھا کہ ریل کے ذریعے آنے والے لوگ یہیں اُتر جائیں اور ڈھائی تین میل کے سفر سے بچ جائیں۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ 'کارکنانِ استقبالیہ' میں سے کوئی ایک صاحب ہی ہالٹ پر موجود ہوتے جو بلا سے "خوش آمدید" نہ کہتے اتنا تو فرما دیتے کہ یہیں اُتر جاؤ۔ ہماری سپیشل ٹرین کوئی آدھی رات کو بھی نہ آئی تھی بلکہ ایسے وقت ہالٹ پر پہنچی تھی کہ ہم نے گاڑی سے اُتر کر کیچے پلیٹ فارم پر فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد کافی دیر اسی "حالتِ منتظرہ" میں گذر گئی کہ "کارکنانِ استقبالیہ" یا "رہنمایانِ قافلہ" کی جانب سے کوئی ہدایت ملے۔ لیکن وہاں غالباً کوئی مقامی کارکن موجود ہی نہیں تھا لہٰذا قافلے کے رہنما بھی متردّد رہے ——— اور اُدھر ریلوے والوں نے یہ دیکھ کر کہ کوئی اترنے کا نام ہی نہیں لیتا، گاڑی چلا دی اور چند منٹوں میں دیوبند کے مستقل سٹیشن پر لے جا کر کھڑی کر دی۔ ؎

اور وہاں وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ ایک لدی پھندی سپیشل ٹرین کے تمام کے تمام مسافر جب ایکدم پلیٹ فارم پر اترے تو فی الواقع تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور بالائی پل نے تو واقعتہً "پُل صراط" کی صورت اختیار کر لی۔ جُوں توُں کر کے باہر پہنچے تو وہاں بھی نہ کوئی 'دفترِ استقبالیہ' تھا نہ کوئی رہنمائی کرنے والا کارکن ——— کارکنوں اور رہنماؤں کی اس 'کم کوشی' کے پس منظر میں غریب قلیوں کا یہ کردار بہت ہی تابناک نظر آیا کہ انہوں نے اس دینی و مذہبی اجتماع میں شرکت کے لئے آنے والوں سے مزدوری لینے سے انکار کر دیا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، لیکن سب کے چہروں پہ آنے والوں کے لئے محبّت اور عقیدت کے جذبات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے ——— راقم نے جب دل ہی دل میں اس صورتِ حال کا موازنہ وطنِ عزیز پاکستان کے حالات سے کیا تو یہ محسوس کر کے شدید ندامت ہوئی کہ ہمارا تو غریب بھی بالعموم ان جذبات و احساسات سے عاری ہو چکا ہے'

اب دارالعلوم یا اجتماع گاہ تک جانے کے لئے سواری کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اسٹیشن پر لے دے کہ چند سائیکل رکشائیں تھیں جو "یک انار و صد بیمار" ——— کا

مصداق بن کر رہ گئیں - الغرض افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم بپا ہوگیا - ادھر مقامی کارکن کوئی بھی نہیں جو کچھ تو بتلائے کہ کیا کریں کیا نہ کریں - کافی دیر بعد مولانا اسعد مدنی نظر آئے جو دو تین کاریں ساتھ لائے تھے - انہوں نے چن چن کر اپنے جاننے والوں (جن کی اکثریت بزرگ اور معمّر علماءِ کرام پر مشتمل تھی!) کو گاڑیوں میں بٹھانا شروع کیا - باقی لوگوں کی جانب التفات کا ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی موقع نہ تھا بہر حال جیسے تیسے ایک سائیکل رکشا حاصل کی اور سامان اس پہ رکھ کر خود پیدل مارچ شروع کیا - دارالعلوم کا سیدھا راستہ جو قصبے کے اندر سے ہو کر گذرتا تھا حکومت نے بند کر دیا تھا - لہٰذا پورے قصبے کا چکّر کاٹ کر اور ایک طویل مسافت طے کر کے دارالعلوم پہنچے تو وہاں بھی افراتفری و بدنظمی ـــــ معلوم ہوا کہ 'استقبالیہ کیمپ' دارالعلوم کی دوسری جانب ہے - وہاں پہنچے تو حکم ملا "نو بجے آئیے" اللہ اکبر! نظم وضبط اور قاعدہ و قانون کا یہ عالم اور ان ہنگامی حالات میں بھی دفتری اوقات کی اس شدّت کے ساتھ پابندی! چار و ناچار نو بجے تک باہر دھوپ ہی میں پڑے رہنے کے بعد جب دوبارہ "وقتِ موعود" پر حاضری دینے پہنچے تو نظر آیا کہ "مدعوئین" اور "مندوبین" کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں - جنھوں نے اپنے طول اور جگہ کی قلّت کے باعث کئی کئی بل کھائے ہوئے ہیں - ایک قطار میں کافی دیر کھڑے رہنے کے معلوم ہوا کہ یہ پاکستان کی نہیں بنگلہ دیش کی ہے ـــــ وہاں سے نکل کر دوسری میں آ گئے، لیکن بہت دیر کھڑے رہنے کے باوجود جب نظر یہ آیا کہ کام تو دائیں بائیں اور عقب سے آنے والوں کا ہو رہا ہے ـــــ اور قطار "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمّد!" بنی جی کھڑی ہے تو "مدعوئین" ـــــ اور "مندوبین" کی فہرست میں شامل ہونے کی کوشش ترک کر دینے ہی میں عافیت نظر آئی ـــــ اس کے بعد حاجی افضل صاحب ہی کی مہربانی سے کس طرح دارالعلوم کے طلبہ کے قیام کے کمروں میں سے ایک کمرے پر 'بے ضابطہ' قبضہ کیا اور شام تک نظم وضبط اور حسنِ انتظام کے جو جو مظاہرے سامنے آئے ان کی داستان بڑی طویل ہے ـــــ ع "قیاس کن زِ گلستانِ من بہارِ مرا!"

سہ پہر کو دارالعلوم کے مختلف شعبوں خصوصاً لائبریری کی سیر کی - بعد ازاں قصبے میں گھومے پھرے اور نمایاں تضادات کا مشاہدہ کیا - ایک جانب چھتّے والی مسجد

بقیہ ص۱۷ پر دیکھئے

اسرار احمد

نشرُ القرآن

یعنی درسِ قرآن مجید پر مشتمل نشری تقاریر

۱۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝

یہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸۵ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

"ہر جاندار کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے اور قیامت کے دن تمھیں پورا پورا اجر دے دیا جائے گا۔ پس جو آگ سے بچا لیا گیا اور جنّت میں داخل کر دیا گیا اس نے بھرپور کامیابی حاصل کر لی۔ اور یہ دُنیوی زندگی تو سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ ہے ہی نہیں !"

سورۂ آلِ عمران اور سورۂ بقرہ دونوں کو آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مشترک نام "الزھراوین" سے موسوم فرمایا ہے یعنی دو انتہائی روشن اور تابناک سورتیں۔ ان دونوں کے مابین بہت سی دوسری مشابہتوں کے ساتھ یہ امر بھی مشترک ہے کہ دونوں تقریباً مساوی نصفین میں منقسم ہیں۔ دونوں کے نصفِ اوّل میں روئے سخن اصلاً اہلِ کتاب کی جانب ہے اور نصفِ ثانی میں خطاب مسلمانوں سے ہے بحیثیتِ اُمّتِ مُسلمہ ! اس فرق کے ساتھ کہ سورۂ بقرہ میں اہلِ کتاب میں سے تمام گفتگو یہود کے ساتھ ہوئی ہے اور سورۂ آلِ عمران میں اکثر و بیشتر نصاریٰ کے ساتھ۔ سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں سے خطاب یوں تو آیت ۱۰۰ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور سورت کے اختتام تک چلتا ہے لیکن اس میں درمیانی آیات یعنی از آیت ۱۲۱ تا آیت ۱۸۰ تو ایک نہایت ہی مربوط اور مسلسل خطبے کی صورت میں ہیں جس میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات پر نہایت بھرپور تبصرہ بھی ہے اور اُس کے معاً بعد مترتّب ہونے والے اثرات کے ضمن میں مفصّل ہدایات بھی۔ اس کے بعد چار آیات میں ایک مختصر حوالہ ہے یہود

ایک تو 'چکھنا' ہی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے۔ اس لئے کہ 'مرنے' اور 'موت کا مزا چکھنے' میں نتیجے کے اعتبار سے خواہ کوئی فرق نہ ہو، سامع یا قاری پر اثرات کے مُرتّب ہونے کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر یہ 'چکھنا' یہاں ذاق یذوق سے فعل کی صورت میں نہیں آیا بلکہ اسم فاعل کی صورت میں آیا جس میں تاکید اور زورِ کلام اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے میں لازماً کا اضافہ کیا گیا — یعنی: "ہر جاندار کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے!" — واضح رہے کہ جُملہ اسمیّہ میں جو تاکید اور توثیق ہوتی ہے وہ جملہ فعلیّہ میں نہیں ہوتی — !!

آگے فرمایا کہ تم سب کو اپنے کئے کا پورا پورا بدلہ قیامت کے روز مل جائے گا — قربان جائیے اس بلاغت کے کہ اس میں ایک طرف جانب کفّار و منکرین خواہ وہ مشرکین میں سے ہوں خواہ اہلِ کتاب میں سے۔ پھر خواہ یہود میں سے ہوں خواہ مارِ آستین منافقین میں سے، اِن سب کے لئے شدید تہدید و وعید ہے — اور دوسری جانب مومنینِ صادقین کے لئے تسلّی بھی ہے اور دلجوئی بھی، گویا بشارت کا پورا سامان موجود ہے، اِس لئے کہ ان کے حق میں "یوم القیامہ" رحمتِ خداوندی کے ظہور کا دن ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ	(یعنی) اُس نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کر لیا ہے۔ وہ لازماً جمع کرے گا تمھیں قیامت کے دن، اس میں ہرگز کوئی شک نہیں!

اہلِ ایمان تو درحقیقت اُسی دن کے اُمیدوار ہیں، اور ان کے سارے حوصلے اور ولولے اور تمام آرزوئیں اور اُمنگیں اُسی دن سے وابستہ ہیں، اس لئے کہ وہ ان کی اپنے ربّ سے ملاقات کا دن بھی ہے اور اپنے خالق و مالک اور محبوبِ حقیقی کے دیدار کا بھی۔ ان کے لئے اس دن کے ذکر میں دھمکی کا اثر نہیں بلکہ تسلّی و دلجوئی یعنی REASSURANCE کی کیفیت ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں اجر کی جمع اُجُور اور صیغۂ مضارع مجہول یعنی تُوَفَّوْنَ کے الفاظ بہت قابلِ توجّہ ہیں اس لئے کہ 'اجر' کہتے ہیں کسی عمل کے بدلے کو جیسے مزدوری کی اُجرت یا کسی نیکی یا بدی کا ثواب یا عذاب، اور یہ لازماً حساب کتاب کی چیزیں ہیں جن میں عمل کی مقدار کی مناسبت ہی سے اُجرت ملتی ہے، بخلاف 'فضل' کے کہ اُس میں کسی حساب کتاب یا ناپ تول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ضمن میں تو کہیں کے علماء و عوام اور ان کے زیرِ اثر منافقین کی شرارتوں کا — اور اس کے بعد آتی ہے

زیرِ درس آیت جس کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ اُن میں رُوئے سخن دونوں جانب قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک طرف مومنینِ صادقین کے لئے ان الفاظِ مبارکہ میں بشارت ہے تو دوسری جانب یہود اور منافقین کے حق میں انہی میں تہدید و انذار بھی موجود ہے' اور سلسلۂ کلام سے علیحدہ کر کے اگر نگاہ کو صرف اس آیۂ مبارکہ ہی پر مرتکز کر دیا جائے تو یہ خود اپنی جگہ ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید، معاد اور رسالت میں سے انسان کے افعال و اعمال اور اخلاق و کردار پر مؤثر ہونے کے اعتبار سے اہم ترین ایمان' یعنی ایمان بالآخرہ کے بیان میں معجز نما فصاحت و بلاغت کی حامل ہے ؛

اس آیۂ مبارکہ کا آغاز ہوتا ہے ایک ایسی اٹل حقیقت یعنی UNIVERSAL-TRUTH- کے ذکر سے جس کی تردید کا کوئی امکان ہی نہیں یعنی موت جو زندگی کی عظیم ترین حقیقت ہے، اور جس سے کسی ذی حیات کو رُستگاری نہیں سوائے اُس ذاتِ "حیّ و قیوم" کے جو خود موت اور زندگی دونوں کا خالق ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط !" — اس سے ایک تو رہنمائی ملتی ہے اُس حکمت کی جانب کہ گفتگو کا آغاز کسی ایسی بات سے کرنا چاہیئے جو متفق علیہ ہو اور جس سے انکار کی تاب و مجال مخاطب کو نہ ہو — خواہ وہ ایک بالکل پیش پا اُفتادہ حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ جو چیزیں انسان کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہتی ہیں - اکثر و بیشتر ان ہی سے غفلت ہو جاتی ہے - دوسرا معاملہ الفاظ اور اُسلوبِ بیان کا ہے، اور ظاہر ہے کہ "کلامُ الملوک مُلوکُ الکلام !" کے مصداق شہنشاہِ ارض و سماوات سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے - ذرا غور کیجئے کہ کُل چار الفاظ ہیں : "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ !" اور ان میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ بھی نہایت حسین و جمیل تراشیدہ ہیرے کے مانند ہے اور پھر بندش اور ترکیب کا کمال مستزاد ہے جس نے حُسنِ کلام کو دوبالا کر دیا ہے — اور پھر سونے پر سہاگہ ہیں صوتی اثرات بھی۔ ذرا غور سے کام لیا جائے تو معاملہ تو صرف انسانوں کا زیرِ بحث ہے لیکن الفاظ : "کُلُّ نَفْسٍ !" کے لائے گئے ہیں - ذرا تقابل کیجئے کہ اگر یہاں الفاظ : "کُلُّ اِنْسَانٍ !" ہوتے تو بات اپنی جگہ پوری ہوتے ہوئے بھی کتنی پھسپھسی اور بے جان سی ہو جاتی — "کُلُّ نَفْسٍ !" نے ایک اٹل اور ازلی و ابدی حقیقت کو ہمہ گیر وسعت بھی عطا کر دی ہے - پھر "ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ !" پر غور کیجئے، اس میں "بغیرِ حساب" کے الفاظ ملیں گے اور کہیں : "مَا یَشَآءُ !" کے — جبکہ یہاں اُجرت کی مناسبت سے لفظ آیا ہے : "تُوَفَّوْنَ" کا — اس لئے کہ : وَفّٰی یُوَفِّیْ کے معنی ہیں کسی کو

کوئی چیز پوری پوری دے دینا اور اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہ کرنا جس کی تاکید مزید کے لئے الفاظ آئے سورۂ ہود کی آیت ۱۰۹ میں: "وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ!" یعنی "ہم اُن کو اُن کے اعمال کا بدلہ دیں گے پُورا پُورا بغیر کسی کمی کے!"۔ یہاں یہ عرض کرنے کی حاجت نہیں ہے کہ یہ الفاظ جب جرم وگناہ کی سزا کے ضمن میں آئیں تو کس درجہ لرزا دینے والے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ سَخَطِكَ ـــــ وَعَذَابِكَ ـــــ	اے ربّ! ہم تیری ناراضی اور سزا سے تیرے ہی عفو و درگذر اور جُود و کرم کی پناہ میں آتے ہیں!

آخر میں فرمایا: جو آگ سے بچا لیا گیا اور جنّت میں داخل کر دیا گیا اُس نے عظیم کامیابی حاصل کرلی! اَللّٰهُمَّ رَبِّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (اے اللہ! ہمیں بھی ان ہی میں شامل فرمادے!) آیت کا آخری ٹکڑا اہم ترین ہے اور یہ دراصل خلاصہ ہے ایمان بالآخرت کا، کہ انسان کی آنکھیں اسی حیاتِ دُنیوی کی زینتوں اور رونقوں اور زیبائشوں اور آرائشوں میں اُلجھ کر رہ جائیں اور آخرت سے نسیان و ذہول لاحق ہوجائے تو پھر یہ ایک دھوکے کی ٹٹّی اور بصیرتِ انسانی کے لئے پردہ اور حجاب بن جاتی ہے، اور اُس کا سارا ساز و سامان متاعِ غرور یعنی دھوکے کا سودا بن کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر انسان آخرت کو پیشِ نظر رکھے اور اسی کو اپنا مطلوب و مقصود بنالے، تو پھر یہی حیاتِ دُنیوی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمانِ مبارک "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ!" ـــ یعنی دُنیا آخرت کی کھیتی ہے کے مصداق ایک حقیقتِ کبریٰ کا رُوپ دھار لیتی ہے، اور انسان یہاں یہ سمجھ کر محنت کرتا ہے کہ یہاں بوؤں گا تو وہاں کاٹ سکوں گا، اور اس طرح رہبانیّت اور ترکِ دُنیا کی جڑ کٹ جاتی ہے: ـــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

۲۔ سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴ تا ۲۷ کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا تم نے غور نہیں کیا کیسے مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیّبہ کی ایک ایسے شجرۂ طیّبہ کے مانند جس کی جڑ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو، اور اُس کی شاخیں آسمان کو چھُو رہی ہوں اور وہ اپنا پھل اپنے ربّ کے حکم سے ہمیشہ بھرپور دیتا ہو ـــ اور اللہ لوگوں کے لئے ایسی تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کرسکیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک شجرۂ خبیثہ کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اُکھاڑ لیا جائے اور اسے کوئی ثبات حاصل نہ ہو۔ اللہ اہلِ ایمان کو قولِ ثابت کے ذریعے دُنیا میں بھی ثبات عطا فرماتا ہے

اور آخرت میں بھی — اور اللہ بے راہ کر دیتا ہے ظلم کرنے والوں کو، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے —!! صدق اللہ العظیم ؂

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ آسمانی کتابوں میں تمثیلات بکثرت بیان ہوئی ہیں، اس لئے کہ اُن کے مخاطب تمام انسان ہوتے ہیں جن میں اکثریت ان عوام الناس کی ہوتی ہے جو اعلیٰ علمی حقائق کو علمی اندازِ بیان اور فنّی اصطلاحات کے حوالے سے تو نہیں سمجھ سکتے، ہاں اگر انہیں عام فہم تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے بات سمجھائی جائے تو سمجھ لیتے ہیں۔ اسی لئے ان تشبیہوں اور تمثیلوں کا ان کے تمام مشاہدات سے ماخوذ ہونا ضروری ہے۔ تورات میں تمثیلیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام تر احکام و شرائع ہی کا مجموعہ ہے یعنی صرف کتاب و شریعت پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ وہ کل کی کل حکمت اور معرفت پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ تمثیل کی ضرورت ایسے ہی اعلیٰ اور لطیف علمی حقائق کی وضاحت کے لئے پیش آتی ہے۔ قرآن چونکہ مجموعہ ہے دلائل و براہین، احکام و شرائع اور حکمت و معرفت سب کا، لہٰذا اس میں تمثیلات کی کثرت اتنی تو نہیں ہے جتنی انجیل میں ہے، لیکن جتنی تمثیلیں بھی اس میں وارد ہوئی ہیں وہ سب ہیں فصاحت و بلاغت کی معراج کی مصداق — ان ہی میں سے دو تمثیلیں یہ ہیں جو ان آیاتِ مبارکہ میں بیان ہوئیں ایک مثال ہے کلمۂ طیبہ یعنی کلمۂ توحید کی — اور دوسری مثال ہے کلمۂ خبیثہ یعنی کلماتِ شرکیہ کی —!!

کلمۂ طیبہ یا کلمۂ توحید کی مثال ایک ایسے مثمر درخت کی ہے جس کی جڑیں بھی مضبوط ہوں، اور زمین کی گہرائی میں اُتری ہوئی ہوں اور شاخیں بھی نہ صرف یہ کہ خوب پھیلی ہوئی ہوں بلکہ بلند بھی اتنی ہوں گویا کہ آسمان کو چھو رہی ہوں۔ واضح رہے کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق درخت کی غذا سے ہے۔ درخت ایک جانب تو زمین سے غذا حاصل کرتا ہے جس کے لئے جڑوں کا مضبوطی کے ساتھ جمے ہونا اور زمین میں گہرا اترے ہونا ضروری ہے۔ دوسری جانب وہ فضا سے بھی غذا حاصل کرتا ہے جس کے لئے اُس کی شاخوں کا چاروں طرف خوب پھیلے ہونا بھی لازمی ہے اور زیادہ سے زیادہ بلند ہونا بھی تاکہ وہ تنازع للبقاء کے اُصول کے تحت آس پاس کے درختوں سے بلند تر ہو کر بلا روک ٹوک فضا سے غذا حاصل کر سکے۔ ان ہی دونوں چیزوں پر دارومدار

ہے اُس کے پھل دینے کا۔ غذا اگر وافر بھی مل رہی ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ بھی مل رہی ہو تو ظاہر ہے کہ پھل بھی اچھے سے اچھا اور ہر موسم پر پورا اور بھرپور آئے گا۔

بالکل یہی مثال کلمۂ توحید کی بھی ہے۔ اس کے تغذیہ و تقویت کا معاملہ بھی دو اطراف سے متعلق ہے۔ ایک فطرت انسانی سے جو صالح زمین سے مشابہ ہے اور جس کی گہرائیوں میں توحید کے صاف شفاف سوتے بہہ رہے ہوں۔ جہاں سے توحید فی العقیدہ، توحید فی العمل اور توحید فی الطلب سب کو غذا ملتی ہے۔ دوسرے آفاقی آیات و شواہد سے، جن پر غور و فکر سے عقل انسانی توحید تخلیق اور توحید تدبیر کا سراغ پاتی ہے۔ ان دونوں کو قرآن مجید نے نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ تو ایک آیت میں اس طرح جمع کیا کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

(یعنی) "ہم عنقریب دکھائیں گے انہیں اپنی آیات آفاق میں بھی اور خود اُن کے نفوس میں بھی یہاں تک کہ یہ بات بالکل کھل جائے..." (حم السجدہ ۵۳)

— اور علیحدہ علیحدہ ان اسالیب میں بیان کیا کہ کہیں تو اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی تلقین فرمائی بحوالۂ الفاظ قرآنی: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اور چونکہ اس کی صلاحیت و استعداد کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے لہٰذا یہ مضمون قرآن میں نسبتاً کم ملے گا آیاتِ آفاقی پر دعوتِ تعقل و تفکر کے مقابلے میں جس کا نہایت کثرت سے اعادہ ہوا ہے بالخصوص مکی سورتوں میں — اور جس کا نہایت جامع خلاصہ ہے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ میں، جسے "آیتُ الآیات" قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا جس کا ترجمہ ہے: "یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں، اور اُس کشتی میں جو لوگوں کی ضرورت کی چیزیں لے کر دریا میں چلتی ہے، اور اُس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا اور اس کے ذریعے زمین کو اُس کے مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کیا، اور پھیلا دیئے اُس میں ہر نوع کے جاندار، اور ہواؤں کے چلنے میں اور اُس بادل میں کہ جو آسمان اور زمین کے مابین مامور ہے نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں!" — الغرض توحید کا شجرۂ طیبہ بھرپور غذا حاصل کرتا ہے فطرتِ انسانی کی زمین سے بھی اور آیاتِ آفاقی میں غور و فکر سے بھی — اور پھر بھرپور پھل لاتا ہے اخلاقِ حسنہ، اعمالِ صالحہ، اور اعلیٰ سیرت و کردار کا — جن کے نمونے ملتے ہیں

انبیاء و صدّیقین، شہداء و صلحاء اور اتقیاء و ابرار کی سیرتوں اور شخصیتوں میں، جو اصل میں ثمرِ طیّب ہیں توحید کے کلمۂ طیّبہ ہی کے شجرۂ طیّبہ کا۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مشرکانہ اوہام و عقائد کا، کہ اُن کے لئے نہ فطرتِ انسانی میں کوئی جڑ بنیاد موجود ہے، نہ ہی اس وسیع و عریض کائنات کے کسی گوشے سے انہیں کوئی تائید حاصل ہوتی ہے۔ گویا اُن کی مثال اُس جھاڑ جھنکاڑ کی سی ہے جو زمین پر ایسے ہی پھیل گیا ہو کہ نہ اُس کی جڑیں گہرائی میں اُتری ہوئی ہوں نہ شاخیں فضا میں بلند ہوں۔ چنانچہ اُس میں نہ پھول لگتے ہیں نہ پھل، نہ اُس کا کوئی سایہ ہی، جو جس کے تلے کوئی تھکا ماندہ مسافر کسی وقت استراحت کرلے، نہ کسی کو کوئی غذا کا سامان ہی اُس سے حاصل ہوتا ہو — پھر یہ کہ اسے کوئی ثبات و قرار بھی حاصل نہیں، جہاں کسی نے ذرا سا ہاتھ لگایا اُس کی جڑیں زمین سے فوراً اُجڑ ہو گئیں۔ جیسے کہیں اوپر ہی رکھی ہوئی تھیں — جب اُس کے برعکس ہے معاملہ کلمۂ توحید کے شجرۂ طیّبہ کا کہ اُسے زمین سے اُکھاڑنا آسان نہیں ہوتا۔ گویا جو لوگ فی الواقع توحید پہ کاربند ہوں اور عقیدۂ توحید ان کے رگ و پے میں واقعتہً سرایت کر گیا ہو ان کو دنیا میں نہ کسی طرح ہراساں کیا جاسکتا ہے نہ خوف زدہ، اور نہ رنجیدہ نہ غمگین، اس لئے کہ توحید کا تو اصل ہی خوف اور غم دونوں سے نجات ہے بفحوائے الفاظ قرآنی: "اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے حقیقی دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے — اور نہ ہی وہ غم و اندوہ سے دوچار ہونے والے ہیں!" — اسی حقیقت کو یہاں ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ: یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (یعنی اللہ توحید کے قولِ ثابت کے ذریعے اہلِ ایمان کو دُنیا میں بھی ثبات و استقلال عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی!) — واضح رہے کہ یہی لفظ "تثبیت" وارد ہوا ہے سورۂ انفال میں جہاں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مدد کے لئے فرشتوں کو بھیجا اس حکم کے ساتھ کہ: "فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" یعنی: "قدم جما دو اہلِ ایمان کے!" — گویا توحید کے کلمۂ طیّبہ کی بنا پر جیسے اہلِ ایمان کے قدم اس دُنیا میں معرکۂ حق و باطل میں جمے رہتے ہیں، ایسے ہی میدانِ حشر میں بھی پورے سکون و ثبات کے ساتھ جمے رہیں گے — اور پھر جنّت میں وہ پھلیں پھولیں گے اپنے ربّ کی رحمتوں اور شفقتوں کے سائے میں — اور اس کے برعکس ہے معاملہ مشرکین کا جن کے ضمن میں فرمایا: "وَیُضِلُّ

اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ۔ واضح رہے کہ ظلم سے قرآن مجید میں اکثر و بیشتر شرک، مراد ہوتا ہے از روئے الفاظِ قرآنی : اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝ (یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے!) ۔ اب ظاہر ہے کہ مشرک کو بھی جس طرح حیاتِ مادّی کے لئے پانی اور ہوا کی ضرورت ہے اسی طرح ضمیر کے اطمینان کے لئے جھوٹ موٹ کی کسی نہ کسی نیکی کا سہارا ضروری ہے۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ اُلٹی سیدھی اور جھوٹی سچّی نیکیاں وہ بھی اپنے نامۂ اعمال میں جمع کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہ اعمال نتیجہ خیز اور بار آور نہیں ہوتے، اس لئے کہ اُن کی پشت پر توحید یا اخلاص موجود نہیں ہوتا چنانچہ ایسی تمام نیکیاں رائیگاں جاتی ہیں۔ جیسے کہ اسی سورۂ مُبارکہ کی آیت ۱۸ میں تمثیل بیان ہو چکی ہے کہ : مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ۝ یعنی : اُن لوگوں کے اعمال کی مثال جنھوں نے اپنے رب کا کفر کیا ایسے ہے جیسے راکھ جس پر کسی آندھی والے دن تیز ہوا چلے۔ چنانچہ جو کمائی (بزعم خویش) انہوں نے کی ہوگی، اس میں سے اُن کے پلّے کچھ بھی نہ پڑ سکے گا۔ (ظاہر ہے کہ) یہی گمراہی کی انتہا ہے!" ۔۔۔ اس اہم مضمون کے لئے ایسی ہی فصیح و بلیغ تمثیل وہ بھی ہے جو سورۂ نور میں وارد ہوئی :

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝	"اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی اُن کے اعمال (یعنی نیکیاں)، اس سراب کے مانند ہیں جو کسی چٹیل میدان میں ہو، اور جسے پیاسا پانی سمجھ رہا ہو۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو اُسے کچھ بھی نہ پائے، بلکہ وہ پائے وہاں اللّٰہ کو جو اس کا حساب چکا دے۔ اور اللّٰہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی ۔۔۔!"

اللّٰہ تعالیٰ ہم سب کو اس دردناک انجام سے بچائے۔ اور توحید کی دولت سے سرفراز فرمائے اور خلوص و اخلاص کی نعمت مرحمت فرمائے۔ آمین ۔۔۔ یارب العالمین ۝

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَآئِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

درسِ حدیث

الحُبُّ لِلّٰہِ وَالبُغضُ لِلّٰہِ

از مولانا محمد حسین ، استاذ عربی ، قرآن اکیڈمی

عن ابی امامۃ، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
: من احبّ اللہ و ابغض للہ و اعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل
الایمان ط (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کیلئے دشمنی کی، اللہ کے لئے بخشش کی اور اللہ ہی کے لئے ہاتھ روکا، اُس نے ایمان کو کامل بنالیا!"

ہمارا دین اسلام ہے۔ اسلام کا معنیٰ ہے سپردگی یا اپنے آپ کو کسی کے حوالے کردینا۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے ہم سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم مکمل طور پر اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیں۔ اور ہمارے مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو کُلیتہً اللہ کے حوالے کردیا۔ یہ کیفیت کسی بندے میں جتنی زیادہ شدید اور اعلیٰ درجے کی ہوگی، اُتنی ہی اس کی عبدیت کامل ہوگی اور اُتنا ہی وہ خدا کا زیادہ محبوب و مقرب ہوگا۔

امرِ واقعی تو یہی ہے کہ اس خاکی زمین سے لے کر اس نیلگوں آسمان کی پہنائیوں تک جو کچھ بھی ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ بلکہ اگر ہم اپنی ذات پر بھی گہری نظر ڈالیں تو یہاں بھی ہر چیز اسی کی اور صرف اسی کی ہے۔ مگر انسان کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت نے ان اشیاء کی محبت سے کچھ اس طرح جذباتی طور پر وابستہ کر رکھا ہے کہ وہ ان غیر مرئی روابط میں بڑی سختی کے ساتھ بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ انسان کو اپنی طرف کھینچنے والی یہ مقناطیسی قوتیں اور اسے مختلف بندھنوں میں جکڑنے والے یہ رشتے اور یہ علائق بے شمار قسم کے ہیں۔ ان میں سے کچھ فطری اور ناگزیر بھی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں انسان نے اپنے مفاد کے لئے مصنوعی طور پر اپنے اردگرد لپیٹ

لیا ہے۔ انسان کے لئے ان میں ایک کیف و سرور ہے، آسائش و آسودگی ہے لیکن اگر ہم واقعتہً خدا تعالیٰ کے وجود، اس کی رحمت کی وسعتوں، اُس کی ربوبیّت اور اس کی آقائی و مولائی پر پورے شعور اور صدق دلی سے ایمان رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو واقعی اس کا بندہ سمجھتے ہیں تو اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کلیتہً ہر چیز سے اس کے حق میں دستبردار ہوجائیں، یہاں تک کہ ہمارے حریم دل میں صرف اس ایک ہی کی محبت جاگزیں ہو۔ ہماری باقی تمام محبتیں اس کی محبت کے تابع ہوں۔ ہم اگر کسی سے محبت کریں تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ والا ہے یا اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر کسی سے دشمنی کریں تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ کا دشمن ہے یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے دشمنی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح ہماری بخشش و عطا بھی اس کی خاطر ہو اور ہمارا بخل و امساک بھی اس کے لئے۔ اس کا حکم ہو تو ہم اپنی پونجی کی آخری کوڑی تک اس پر نثار کر دیں اور اگر اسے پسند نہ ہو تو پھر ہمارے ہاتھ بھی بندھ جائیں ؎

کون نہیں جانتا کہ والدین کی محبت و اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت و اطاعت کے بعد دوسرے درجے پر رکھا ہے۔ قرآن و سنّت ایسے احکام سے بھرے پڑے ہیں مگر فرمایا کہ اس کے باوجود اگر والدین خدا سے بغاوت یا اُس کے ساتھ شرک و کفر کرنے کی ترغیب دیں تو پھر اُن کا کہا مت مانو۔ بیوی اور اولاد سے محبت انسان کا فطری تقاضا ہے، اسلام اس کی تاکید کرتا ہے اور اسے فروغ دینا چاہتا ہے، مگر وہیں تک جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رضامندی اس میں شامل ہے۔ لیکن جب ان کی محبت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنتی ہو تو پھر اُن سے کٹ جائیے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ: اِنَّ من ازواجکم و اولادکم عدوا لکم فاحذروھم۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی مثال کو سامنے رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر محبت کو قربان کر دیا۔ اپنے حقیقی باپ کو جب خدا کا باغی پایا تو اس سے منہ موڑ لیا۔ قوم کو خدا کا سرکش دیکھا تو اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ وطن کی سرزمین کو اپنے مولا کی محبت کے لئے تنگ پایا تو کبھی مصر، کبھی فلسطین اور کبھی جزیرہ نمائے عرب کی خاک چھانی۔ اپنی محبوب و وفا شعار بیوی اور معصوم بچے کو اللہ تعالیٰ کے دین کا مرکز

بنانے کی خاطر، ایک بے آب وگیاہ زمین میں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں لا بٹھایا۔ جہاں زندگی کی کوئی سہولت میسّر نہ تھی۔ چار چار کنال کے رقبہ میں پھیلی ہوئی کوٹھیوں میں تمام مادّی آسائشوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کو تو شاید اس کے تصوّر ہی سے جھرجھری آجائے مگر قرآن گواہ ہے کہ خدا کے ایک بندے نے جس نے کہا تھا کہ : اسلمت لرب العالمین ٥ یہ کر دکھایا اور آخر میں چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ خدا کے اس ضعیف العمر بندے نے اپنے ہونہار، فرمانبردار، نوجوان بچّے کو جو نامعلوم کتنی دعاؤں کے بعد ملا تھا، کے گلے پر محض اللہ کی خاطر بے دریغ چھُری چلادی۔ راہِ محبّت میں یہ قربانی دیتے وقت نہ اس کا اپنا بڑھاپا آڑے آیا، نہ اپنے لختِ جگر کا معصوم چہرہ اس کو مانع ہوا اور نہ ایک بوڑھی ماں کی اُجڑتی گود کے تصوّر نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ یقین ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، گردشِ فلک بھی رُک گئی ہوگی۔ ان فرشتوں نے بھی مُنہ میں انگلیاں ڈال لی ہوں گی جنھوں نے کل خدا کے حضور میں اسے "سفاک و مفسد" قرار دیا تھا۔ مگر دُنیا کی قیادت و امامت یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ اب خود خدا کی طرف سے اعلان ہوا کہ ابراہیم ! تونے جو کہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کے حوالے کر دیا، تو تو نے وہ پورا کر دکھایا۔ اب تم دُنیا کے امام ہو اور دُنیا تمھاری مقتدی۔ تمھارے اس عمل کو ہم نے یوں شرفِ قبولیت بخشا کہ قیامت تک کے لیئے لسے انسانوں کی سُنّت بنا دیا ؛

خود سرورِ کائنات ؐ کی مثال کو سامنے لائیے کہ کس طرح خدا کی خاطر ہر دوسری محبّت اور ہر نفرت کو دل سے نکال دیا۔ اپنا وطن کسے پیارا نہیں ہوتا، مگر جب دیکھا کہ وطن کی سرزمین خدا کی عبادت کے لیئے تنگ ہو رہی ہے تو اس کو ان الفاظ کے ساتھ الوداع کہہ دیا کہ اے مکّہ ! تو مجھے سب شہروں سے زیادہ عزیز ہے مگر تیرے باسی مجھے یہاں رہ کر اپنے محبوبِ حقیقی کی عبادت کی اجازت نہیں دیتے۔ حبشی ؓ پیارے چچا۔ حمزہ ؓ کے قاتل ہیں۔ مگر جب وہ ایمان لاکر اللہ کے دین میں آجاتے ہیں تو حضور ؐ اُن کو سینے سے لگا لیتے ہیں ؛

۹۰

میں سوچا کرتا تھا کہ ہم تعداد میں نوّے کروڑ ہونے اور ہر طرح کے مالی وسائل رکھنے کے باوجود آخر کیوں ذلیل و خوار ہیں اور صحابہ ؓ مٹھی بھر اور بے سروسامان ہو کر بھی کس طرح

بساطِ عالم پر چھا گئے۔ تو بات اس طرح سمجھ میں آئی کہ وہ کاملاً خدا کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اُن کے سارے جذبات و عواطف خدا کی محبت کے تابع تھے۔ انہوں نے محض اللہ کی خاطر اپنے دشمنوں سے پیار کر لیا اور محض خدا ہی کی خاطر اپنے حقیقی خون کے رشتہ داروں سے نہ صرف کٹ گئے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میدانِ جنگ میں اپنے رشتہ کے ماموں کو اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو اپنے سگے والد کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر جنگِ بدر میں جس میں تم کفّار کے ساتھ تھے، میری تلوار کی زد میں آجاتے تو کبھی بچ کر نہ جاتے اور باپ بیٹے کا یہ خونی رشتہ کبھی ہمارے درمیان حائل نہ ہو سکتا ۔

"الحُبّ للّٰہ والبُغض للّٰہ" کا یہی وہ مقام ہے جسے فنا فی اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ انسان اپنی پسند و ناپسند، محبّت و عداوت غرض ہر طرح کے جذبات کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع کر دے۔ آج ہم اُس کی رحمتوں اور نصرتوں سے اِسی لئے محروم ہیں کہ ہماری دشمنی اور محبّت کا معیار بدل گیا ہے۔ ہم خدا کی نافرمانی برداشت کر سکتے ہیں، لیکن کسی رشتے کو خدا کی خاطر کاٹنا گوارا نہیں کرتے۔ ہمیں خدا کے باغیوں اور سرکشوں سے محبّت ہے، صرف اس لئے کہ اُن سے ہمارے ایسے مفادات وابستہ ہیں جن کو ہم خُدا کی خاطر نہیں چھوڑ سکتے۔ جب ہم خُدا سے محبّت اور اُس سے تعلّق کے مقابلے میں اپنے مفادات کی محبّت اور اپنے وابستگان سے تعلّقات کو ترجیح دینے لگے تو پھر اس کی نصرتیں اور رحمتیں ہمیں کیسے حاصل ہوتیں۔ ہم نے اُسے چھوڑا تو اُس نے بھی ہمیں چھوڑ دیا: نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُ اِلٰی حُبِّکَ ط وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

حدیث

المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب ط (البيهقي في شعب الايمان)	مجاہد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے، اور مہاجر وہ ہے جو برائیوں اور گناہوں کو چھوڑ دے!

اِسلامی سَن کی ابتداء

مولانا محمد امین اثری (علی گڑھ، انڈیا)

یہ حقیقت ہے کہ قومی زندگی کی بنیادی چیزوں میں سے ایک نہایت اہم چیز سن اور تاریخ ہے۔ جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے، یہ اس کی قومی زندگی کی روایات کو قائم رکھتا ہے اور دُنیا میں اُس کے اقبال و عروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے۔ یہ قومی زندگی کے ظہور و عُروج کی ایک جاری و ساری یادگار ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کی متمدّن قوموں میں متعدد سن رائج تھے۔ زیادہ مشہور سن یہودیوں، رومیوں اور ایرانیوں کے تھے۔ زمانۂ جاہلیّت میں چونکہ عربوں کی اندرونی زندگی اس قدر متمدّن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اس لئے اوقات و موسم کی حفاظت اور یاد داشت کے لئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اسی سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ من جملہ سنون کے عام الفیل بھی تھا۔ یعنی شاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سن استعمال ہوتا رہا۔ لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا تو خود عہدِ اسلام کے واقعات کو یہ اہمیّت حاصل ہو گئی۔ صحابۂ کرام رضؓ کا دستور تھا کہ اسلامی واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اس سے حساب لگاتے۔ مثلاً جب ہجرتِ مدینہ کے بعد وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی تو اسی کو سن کا درجہ دے دیا تھا، لوگ اسے سن اذن سے کرتے تھے۔ اسی طرح سورۂ براءت کے نزول کے بعد بول چال میں سنہ براءت کا رواج پایا جاتا ہے۔ حجۃ الوداع کے واقعہ کو بھی کچھ دنوں تک بطور ایک سن کے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض روایتوں میں صاف تصریح آچکی ہے کہ صحابۂ کرام رضؓ کی بول چال میں سن زیادہ مشہور تھے۔ سنۃ التمحیص، سنۃ الترفیہ، سنۃ الزلزال بھی ان ہی میں سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت رہی۔ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور

دفاتر حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوگئے اس لئے ضرورت پیش آئی سرکاری طور پر کوئی ایک سن قرار پا جائے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، میمون بن مہران روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک کاغذ پیش کیا گیا جس پر شعبان کا مہینہ درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ شعبان سے کونسا شعبان مراد ہے، اس برس کا یا آئندہ برس کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہؓ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا اس لئے ضروری ہے کہ حساب و کتاب کے لئے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جس سے اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں اس پر لوگوں نے کہا کہ اس کے متعلق ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیئے، اور دریافت کرنا چاہیئے کہ اُن کے یہاں اس کے کیا طریقے ہیں؟

اسی طرح طبری نے امام شعبی سے نقل کیا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے پاس خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی ۔ اور یہ وقت تھا جب کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے اور خراج کے اُصول و ضوابط طے پا گئے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ ضبطِ اوقات کے لئے ایک خاص تاریخ قرار پا جائے۔ پرانی تاریخیں موجود تھیں لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کریں۔ اب ابو موسیٰ اشعری کے لکھنے سے حضرت عمرؓ کو اور زیادہ اس کی طرف توجہ ہو گئی تھی۔ اس لئے صحابہؓ کو پھر جمع کر کے مشورہ کیا تو بعض نے رائے دی کہ ایرانیوں کے یہاں آخری سنہ یزدگرد کا سنہ ہے اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ ان ہی دونوں میں سے کسی کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ پھر خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کی ابتداء کی جائے اور بعض نے رائے دی کہ حضورؐ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن کوئی بات طے نہ پا سکی کہ اخیر میں حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ واقعہ ہجرت سے سنہ کی ابتداء کی جائے تو بہتر ہے تو لوگوں نے اس سے اتفاق کیا اس وقت واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گذر چکے تھے۔

الغرض اسلامی سنہ کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ہمیشہ

وابستہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لئے اسلام کا ظہور تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش تھی، بدر کی تاریخی فتح تھی، مکہ کا فاتحانہ داخلہ تھا، حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل اور فتح کا آخری اعلان تھا۔ لیکن ان واقعات میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہیں کیا گیا اور نظر گئی تو ایسے واقعہ کی طرف جو نہ تو کسی کی پیدائش کا جشن تھا اور نہ کسی کی شوکت کا ظہور، نہ کسی غلبہ اور تسلط کا شادیانہ بلکہ ایک ایسے زمانہ کی یاد تھی جبکہ آغازِ اسلام کی بے سروسامانیاں اور بظاہر ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ محسنِ انسانیت، ہادیٔ اعظم، پیغمبرِ آخرالزماں، ساقیٔ کوثر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے وطن عزیز میں زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا بیچارگی اور مظلومیت کی انتہا تھی کہ اپنا عزیز وطن، اپنا گھر، اپنے عزیز و اقارب اور اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک رفیق غمگسار کے ساتھ رات کی تاریکی میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ تاریخ کا یہ واقعہ دنیا کی تمام تاریخوں اور قومی یادگاروں کے خلاف تھا۔ اقوامِ عالم فتح و اقبال سے اپنی تاریخ شروع کیا کرتی ہیں۔ لیکن صحابۂ کرام رضؓ کا یہ نرالا اور اچھوتا انتخاب تھا کہ بے چارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی طاقت و شوکت کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جبکہ وہ ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر کے انسانوں کو محکوم بنا لیا کرتی ہیں۔ لیکن صحابۂ کرامؓ کا یہ یقین تھا کہ ان کی طاقت اور شوکت کا دروازہ اس وقت کھلا جب انہوں نے اپنے وطنِ مالوف کو خیرباد کہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی کامرانیاں ہجرت اور اس دور کے اعمال میں ہی مضمر ہیں اس لئے اوّلیت واقعۂ ہجرت کو حاصل ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر صحابہ کرام رضؓ نے قومی سنہ کا مبداء واقعۂ ہجرت کو قرار دیا تاکہ نہ صرف آغازِ سال ہر ماہ محرم میں اس کی یاد تازہ ہوتی رہے۔ بلکہ جب بھی یہ سن نظر سے گذرے تو اس کی معنوی فتح مندی کی یاد دہانی ہوتی رہے ——!!

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ریاست، اقتدار، دولت اور حکومت کے لئے نہ تھی بلکہ آپؐ کی ہجرت اعلائے کلمۃ اللہ اور تبلیغ و دعوتِ حق اور ادائیگی امانت رسالت نیز شہادتِ حق کے لئے تھی۔ چنانچہ آپؐ کی جدّوجہد کے نتیجے میں ساری دنیا میں اسلام کا پرچم لہرایا اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہوا اور مشرق و مغرب میں

لوگ دینِ اسلام کے تابع ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ذیل کے نتائج کی حامل ہے۔ (۱) شجاعت و بہادری (۲) راہِ خدا میں محنت و مشقت (۳) صبر و تحمل (۴) اخلاص (۵) اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب۔

اب جبکہ مسلمانانِ عالم نے پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کی تقریبات منانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے چودھویں صدی کے آخری سال جو اب ماہِ محرم سے شروع ہوا ہے اور پندرھویں صدی کے پہلے سال جو کہ ماہِ محرم سے شروع ہوگا، کا انتخاب کیا ہے۔ اِن استقبالیہ تقریبات کے آغاز پر خداوندِ عالم سے دعا ہے کہ اسے پوری اُمتِ مسلمہ کے لئے خیر و برکت، امن و سلامتی کا سال بنائے اور اُمتِ مسلمہ کی تحریکِ اقامتِ دین کہ جو عملاً جدّ و جُہد میں مصروف ہے، کامیابی عطا فرمائے۔ نیز مجاہدین کی مدد و نصرت فرمائے اور اُمتِ مسلمہ کو متحد و منظم جدّ و جُہد کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کی تقریبات منانے کا تقاضا ہے کہ ہم برائی سے اجتناب کر کے بھلائی کا راستہ اختیار کریں، شر سے ہجرت کر کے خیر کی طرف گامزن ہوں، شہواتِ نفسانی اور لذّاتِ شیطانی سے باز آئیں، کتمانِ حق کا رویّہ چھوڑ کر شہادتِ حق کے مقام پر آئیں اور فریضۂ اقامتِ دین کی ادائیگی میں کما حقّہٗ جدّ و جُہد کریں — اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: بقیہ صفحہ ۲۵ پر دیکھئے

مراد آباد (انڈیا) سے جناب افتخار احمد فریدی اطلاع دیتے ہیں!

"۲۳ مارچ کو دیوبند سے واپس مراد آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری اہلیہ طاہرہ خاتون کا دوپہر چند منٹ کی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ گھر کے تین فرد تھے اب دو رہ گئے ہیں محمد اُسامہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسی رنج و غم کے ماحول میں اُس کی شادی کی گئی ہے۔ دُعا کی بہت ضرورت ہے مرحومہ کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی — اگر 'میثاق' میں دُعائے مغفرت کے لئے چند الفاظ دے دیں تو بڑا کرم ہو۔ وہاں کے بہت سے تعلق والوں کو معلوم ہو جائے گا، کچھ پہنچا سکیں گے!" — اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنّت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!! (ادارۂ میثاق)

سلسلۂ تقاریر سیرت ۷

انقلاب نبویؐ کے خلاف تخریبی ردّعمل

یعنی "الفتنۃ الکبریٰ"

اسرار احمد

شامِ ہمدرد میں مختلف مقامات پر پچھلے دنوں اخلاق کا موضوع زیر بحث رہا ہے پشاور میں میں نے تقریر کی تھی کہ "انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق" صدفی صد درست ہے۔ لیکن انفرادی اخلاق تو پہلے بھی بہت بلندی پر تھا۔ عفو، درگذر، احسان ایثار۔۔ اس کی مثالیں سابقہ انبیاء میں بھی ملتی ہیں۔ خود حضرت مسیح علیہ السّلام کی تعلیم تھی کہ "دشمن سے محبّت کرو، اپنے آپ کو جھٹلا دو، دوسرے کو جھوٹا نہ کہو"۔ انہوں نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا اور پکڑ لیا تو اُس نے کہا میں چوری تو نہیں کر رہا تھا آپؑ نے فرمایا: "ہاں بھئی! میری آنکھ نے غلط دیکھا!"۔ لیکن یہ تھا انفرادی اخلاق۔ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے اجتماعی اخلاق دیئے ہیں۔ آپؐ نے نظامِ اجتماعی کو اخلاق کی بنیاد پر قائم کیا، یہ ہے اصل کارنامہ! ذہن میں رکھیے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اصل کارنامہ کیا ہے۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ط ایک کامل دین کی حیثیت سے اس کو قائم کر کے اور چلا کر دکھا دینا اور اس کی برکات کا ظہور اس طرح ہونا کہ پوری نوعِ انسانی اُن سے متمتّع ہو۔ میں اس کے لئے یہ تشبیہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے کبھی کوئی انسان حسین خواب دیکھے اور پھر اُس کی یاد ذہن میں محفوظ و برقرار رہے۔ نوعِ انسانی کے اجتماعی شعور COLLECTIVE MEMORY - میں خلافتِ راشدہ اس حسین خواب کے مانند ہے جو بنی نوعِ انسان دیکھ رہی ہے کہ اس رُوئے ارضی پہ ایک نظام کبھی ایسا بھی تھا اور یہ ہے محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے اصل اتمامِ حُجّت۔ لیکن اب آتا ہے اس کا دردناک پہلو اور وہ ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری ایّام

میں فتنہ ۔ الفتنۃ الکبریٰ کا ظہور ۔ اس کو بالکل SCIENTIFICALLY سمجھ لیجئے کہ اصل میں یہ تھا کیا۔ DETAILED EVENTS میں آدمی گم سا ہو جاتا ہے لیکن یہ یاد رکھئے ایک ہے علم تاریخ اور ایک ہے فلسفۂ تاریخ ۔ فلسفۂ تاریخ DE-TAIL میں نہیں جایا کرتا کہ فلاں تاریخ کو کیا دن تھا، دوشنبہ کا دن تھا یا سہ شنبہ کا۔ ٹھیک ہے وہ بھی RESEARCH کے موضوعات ہیں۔ فلسفۂ تاریخ یہ ہے کہ EV-ENTS کیوں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اجتماعی حادثات کے اسباب کیا ہیں۔ تو اب سمجھئے کہ یہ فتنہ اصل میں تھا کیا۔ اس کے پس منظر میں یہ سمجھ لیجئے کہ REVOLUTION کے ساتھ COUNTER REVOLUTION کا فلسفہ میں کل بھی بیان کر چکا ہوں، آج بھی بیان کیا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ کسی انقلاب کے تکمیلی مراحل جب بالکل اپنی آخری حدود کو آتے ہیں تو مخالف قوتیں دبک جایا کرتی ہیں لبادہ اوڑھ لیتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ جب موقع ملے گا تو ہم انتقام لیں گے۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ لبادہ اوڑھ لو، جان بچاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں انقلاب مکمل فرمایا۔ ان کے خلاف جو تحریکیں اٹھیں اُن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبرد آزما ہوئے۔ پھر خلافتِ فاروقی و عثمانی کے دوران جو بین الاقوامی سطح پہ انقلابِ محمدیؐ کا سیلاب آیا۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ اس سلسلے میں کون کون سی AGGRIEVED PARTIES تھیں اور زک کنہوں نے اٹھائی تھی، یہ تجزیہ بڑا عجیب ہوگا۔ ذرا توجہ کو مرتکز کیجئے۔ جہاں تک شرک کا تعلق ہے، اُس کا تو قلع قمع ہو چکا تھا اور وہ ختم ہو چکا تھا۔ باقی دو مذاہب تھے عیسائیت اور یہودیت۔ یہ دونوں وہ مذاہب تھے جن سے اسلام کا براہِ راست تصادم ہوا اور دو ہی سیاسی قوتیں یعنی سلطنتِ رُوما اور سلطنتِ کسریٰ تھیں، جن سے اسلام کا تصادم ہوا۔ ان مذاہب میں سے عیسائیوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی تصادم نہیں ہوا۔

جزیرہ نمائے عرب میں نجران وغیرہ مقامات پر جو عیسائی تھے انہوں نے معاہدہ کر لیا تھا۔ ہاں! یہودیوں کا معاملہ دوسرا تھا۔ میں بیان کر چکا ہوں بنو قینقاع نکلے، بنو نضیر نکلے۔ بنو قریضہ کے کئی سو افراد قتل ہوئے، خیبر اُن کا بڑا قلعہ تھا، وہ اُن کے ہاتھ سے گیا۔ مذہبی سیادت اور چودھراہٹ اُن کے ہاتھ سے گئی۔ لہٰذا مذہبی سطح پہ

یہودیت اسلام کی سب سے بڑی دشمن تھی - جیسے الجبرے کے QUESTIONS کبھی حل کیا کرتے تھے - ایسے ہی ایک نتیجہ نکال کر رکھ لیجئے کہ ۱۔ سیاسی اور مملکتی سطح پر میں عرض کر چکا ہوں کہ سلطنتِ رُوما کی تین ٹانگیں تھیں - دو ٹوٹ چکی تھیں ایک برقرار تھی نام تو نہیں مٹا، وہ تو اُس وقت مٹا ہے جب قسطنطنیہ فتح ہوا ہے - لیکن سلطنتِ کسریٰ تو اس طرح نیست و نابود ہو گئی جیسا کہ اُس کا وجود ہی نہ تھا - کون زیادہ AGGRIEVED ہے؟ وہ مملکت جو پورے عرب کو اپنی جاگیر سمجھتی تھی - جس نے حضورؐ کو اپنی رعیت کا ایک فرد سمجھ کر گرفتاری کا حکم دیا تھا - ذرا اُس کے طنطنے اور اُس کے غرور کا تصوّر کیجئے اور پھر یہ بھی تصوّر کیجئے کہ اُس کا نام و نشان باقی نہ رہے - فلسفۂ تاریخ کے اعتبار سے ایک اور بات بڑی اہم ہے - سلطنتِ روما COSMOPOLITAN تھی - بے شمار قومیتیں، بے شمار نسلیں، بے شمار زبانیں اُس میں بولی جاتی تھیں - کوئی ایک مرکزی NATIONALISM اس کی پشت پر نہ تھا جیسا کہ ایران میں ایک زبان، ایک کلچر، ایک تہذیب، بہت حد تک ایک نسل تھی اور اس طرح ایک بہت بڑا — NATONALIST SENTIMENT وہاں پر موجود تھا - یہ اڑھائی ہزار سالہ جشن جو منایا گیا تھا اور اپنی پرانی بنیادوں کو از سرِ نَو زندہ اور تازہ کرنے کا جو عزم تھا اس کا رشتہ اُسی سے جوڑا گیا تھا، اس کو بھی ذہن میں رکھئے -

فردوسی نے عربوں کے بارے میں جو اشعار کہے ہیں، وہ عربوں کے بارے میں ایرانیوں کی ذہنیت کی پوری عکاسی کرتے ہیں - وہ کہتا ہے اور دیکھئے عربوں کے متعلق کتنی نفرت اور استہزاء کا اظہار کیا ہے ؎

نہ شیر شتر خوردن و سوسمار ❊ عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملکِ کیاں را کند آرزو ❊ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

یہ اُونٹنیوں کا دودھ پینے والی قوم اُجڈ، گنوار اور سوسمار (گوہ) کھانے والی وحشی قوم، اُس کی یہ جرأت؟ کہ عظمت و سلطنتِ کیانی حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے - اس بات کو ذہن میں رکھئے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے REACTIONARY FORCES اُبھری ہیں - انتقام کا آغاز ہوا، جس کا پہلا مظہر ہے شہادتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ — ایران نے وار کیا، اور بھرپور وار کیا - آپ کو معلوم ہے اُن کا

قاتل کون تھا؟ ابولؤلؤ فیروز جو جنگِ نہاوند میں CAPTURE ہوا۔ غلام بنا حضرت مغیرہ بن شعبہ کے حصّے میں آیا۔ اُس کا پشت پناہ کون تھا؟ ہرمزان، ایک سابقہ گورنر۔ یہ ایک مکمّل سازش تھی، اور وہ کئی دن پہلے دھمکی دے گیا تھا۔ بظاہر شکایت لے کر آیا تھا کہ مجھ پر میرے مالک مغیرہ بن شعبہ نے ٹیکس زیادہ مقرّر کر رکھا ہے حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا کرتے ہو؟ کیا کیا فن جانتے ہو؟ اُس نے اپنے فنون گنوائے۔ میں فلاں کام بھی جانتا ہوں اور فلاں کام کا بھی ماہر ہوں، چکیاں بھی بناتا ہوں، پنھیار بنانا بھی جانتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر یہ رقم زیادہ نہیں۔ طیش میں آکر جانے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر چکیاں بنانا جانتے ہو تو میرے لئے بھی ایک چکّی بنا کر لانا۔ کہنے لگا: آپ کے لئے تو میں وہ چکّی بناؤں گا جسے دُنیا یاد رکھے گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ لیکن وہاں PREVENTIVE DETENTION یا SAFETY ACT کے قوانین تو تھے نہیں کہ فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ اسلام میں حرّیت ہے۔ جب تک کسی جرم کا ظہور نہ ہو سزا کیسی؟ اگر ظن ہے تو ظن پر تو بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ۔ شہادتِ عمر فاروقؓ سے شاید ایک ہی دن پہلے حضرت عمرؓ کے صاحبزادے نے دیکھا کہ ہرمزان اور وہ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ جب دیکھا کہ کوئی آ رہا ہے تو گھبرا کر وہاں سے چلے۔ گھبراہٹ میں ایک خنجر بھی گرا جسے اُس نے اُٹھا لیا۔ سارے شواہد موجود ہیں۔ ہرمزان کے ساتھ اُس کی یہ ملاقات، گھبراہٹ اور خنجر سارے قرائن پوری کہانی خود کہہ رہے ہیں۔ پھر مسجدِ نبویؐ میں جس طرح یہ واقعہ پیش آیا وہ بھی آپ کو معلوم ہے، اس کے لئے وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ حضرت عمرؓ سے اتنی دشمنی کیوں تھی۔ دشمنی حضرت ابوبکرؓ سے بھی تھی مگر اتنی نہیں، کیوں؟۔ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے زمانے میں شامِ کسریٰ کی فتوحات کا صرف آغاز ہوا تھا۔ فرمانِ نبویؐ کے مطابق سلطنتِ کسریٰ کو پُرزے پُرزے کرنے والے حضرت عمر فاروقؓ ہی ہیں۔ اس لئے اصل عداوت، دشمنی اور بُغض اُن سے رکھا۔ جو ذرا معتدل قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ حضرت ابوبکرؓ کو معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن جو چرکا انہوں نے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں کھایا ہوا ہے اُس کو کیسے معاف کر دیں۔ ابولؤلؤ فیروز کی تصاویر مقدّس سمجھی جاتی ہیں اور DECORATION کے طور پر اس طرح لگائی جاتی ہیں جس طرح ائمۂ اہلِ بیت کی۔ یہ

تاریخی حقیقت ہے، اِس کو سامنے رکھئے، نہ پڑھنا چاہیں تو بات اور ہے۔ سمجھا یہ گیا تھا کہ شاید عمرؓ ہی بھاری پتھر ہیں، یہ ہٹ گئے تو معاملہ صاف ہو جائے گا۔ لیکن معلوم ہوا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب اتنا بودا نہیں تھا۔ اگرچہ عمرؓ ہٹ گئے لیکن میدان صاف نہ ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں پہلے دس سال تک اسی شان کا حامل رہا جس کا دورِ فاروقی۔ اور اب آتی ہے یہودی سازش جو مکمل سازش، از سرتا پا سازش اور اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی سازش ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دُنیا گواہ ہے کہ یہودیوں کی سازشوں نے بڑی بڑی سلطنتیں اُلٹ دیں۔ علامہ اقبال کا مشاہدہ ہے کہ "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے"۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہر وقت خائف رہتا ہے کہیں یہودی ناراض نہ ہو جائیں، نہیں تو کوئی نہ کوئی سکینڈل شروع ہو جائے گا۔ اگر WATERGATE نہیں تو کوئی خشکی کا گیٹ ہوگا۔ نظر بھی نہیں آئیں گے کہ کہاں گئے۔ یمن کا ایک یہودی عبداللہ بن سبا، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ پال (PAUL) ساری عمر حضرت مسیحؑ کی مخالفت کرتا رہا۔ مگر پھر اس نے جو داؤ کھیلا ہے، عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر اس کی جڑ کاٹ دی۔ توحید کی جڑ کاٹی، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اُلوہیت میں شریک کر دیا اور اس طرح عیسائیت میں انسان پرستی کو داخل کر دیا اور واقعۂ صلیب پر ایسی جذباتی فضا پیدا کی کہ دینِ حق کہیں کا کہیں رہ گیا۔ عیسائیت کی بنیاد تثلیث اور مظلومیتِ مسیح پر قائم ہوئی۔ میں نے یہ مثال اس لئے پیش کر دی کہ مبادا آپ کو یہ خیال ہو کہ کیا ایک یہودی اتنا بڑا کام کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں بعض سادہ لوح لوگ یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ ایک شخص یہ سب کچھ کیسے کر سکتا ہے۔ کیا پال اکیلا نہ تھا کیا مارکس (MARX) اکیلا نہ تھا، مگر دیکھئے کتنے لوگ اس کے فلسفہ و فکر کے نخچیر ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی بھی بڑی شے ہے۔ لبادہ اوڑھا، کانا پھوسی کی، ایک مہم شروع ہو گئی کہ سلطنت تو حضورؐ کے خاندان، حضورؐ کے اہلِ بیت، بیٹی کی نسل یا داماد کا حق تھا یہ کسی اور کے پاس کیسے چلی گئی۔ قبائلی عصبیت کے بارے میں یاد رکھئے کہ دورِ نبویؐ میں بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی۔ بار بار ایسا ہوا، واقعات موجود ہیں۔ انصار و مہاجرین کے درمیان تلواریں کھنچ جاتی تھیں۔ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ

وسلّم کا وجود مسعود تھا کہ جس کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھتی تھی۔ کہیں اوس و خزرج کے درمیان تلواریں کھنچ جاتی تھیں۔ یہ چنگاری دب تو گئی تھی مگر موجود ضرور تھی اور سازشی ذہن اسی کو کہتے ہیں کہ کہاں پھونک ماری جائے۔ یہی صلاحیت ہے اور اسی کا نام ذہانت و فطانت ہے کہ دیکھیں کہ چنگاری کہاں دبی ہوئی ہے جسے پھونک ماری جائے۔ بس اس چیز کو اٹھانا تھا کہ کہانیاں کھڑی ہو گئیں، فلسفے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عثمان رضؓ پر ذاتی طور پر تہمتیں تراشی گئیں، قصّے مشہور ہو گئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسرے کے بارے میں اچھی بات مشکل سے مانتا ہے مگر بُری کو فوراً قبول کر لیتا ہے اس کے لئے بھی خود دورِ نبویؐ سے مثال دے دُوں۔ حضورؐ کے زمانے میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بڑی گھٹیا اور کمینی تہمت لگی اور قرآن گواہ ہے کہ صادقین مومنین بھی اس میں ملوّث ہو گئے۔ یہ انسان کی فطری کمزوریاں ہیں۔ بہرحال اب تو بہت سا پانی گذر چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے انتقال کو لگ بھگ پچیس سال ہونے کو آئے، ربع صدی بیت گئی، صحابہ کبارؓ کی بڑی تعداد اُٹھ گئی تو اب تو گواہوں کے لئے پہلے کے مقابلے میں میدان کہیں زیادہ زرخیز تھا۔ اگر شام میں ہیں تو مصر کے گورنر کی بُرائی ہو رہی ہے، ہر جگہ حضرت عثمان کی برائی ہو رہی ہے۔ یہ ہے اصل بنیاد الفتنۃ الکبریٰ کی، یہ ہے وہ محرّک جس نے تاریخ اسلامی کے پہلے عظیم فتنے کی بنیاد ڈالی اور یہ عجیب HISTORICAL FACT ہے کہ شیعانِ علی کے نام کا لبادہ اوڑھا گیا اور اسی کے لئے زرخیز زمین ثابت ہوئی ایران کی۔ مَیں نے عرض کیا تھا کہ مذہب کی سطح پر سب سے زیادہ AGGRIEVED یہودیت تھی۔ سبائیت اسی کا شاخسانہ ہے۔ مملکت کی سطح پر سب سے زیادہ AGGRIEVED ایرانی قوم تھی، جو بڑی نسل پرست قوم تھی۔ پہلا وار انہوں نے کیا، حضرت عمرؓ شہید ہو گئے اور دوسرا وار انہوں نے کیا، حضرت عثمانؓ کی شہادت ہو گئی اور پھر ان دونوں فتنوں نے ایک شکل اختیار کر لی، جس کا مرکز ایران بن گیا، اتفاقی طور پر نہیں بلکہ اس لئے کہ یہاں اس کو سازگار ماحول مل گیا۔ اس کی جڑیں اس سرزمین میں نیچے اتر سکیں جہاں یہ دونوں AFFINITIES جمع ہو سکیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اب کیا عرض کروں۔ وقت بہت ہو گیا ہے، میرا ایک کتابچہ ہے، مَیں نے چند تقریریں کی تھیں۔ ہمارے بزرگ دوست شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے انہیں جمع

کرکے اس کو کتابچہ کی صورت میں طبع کرا دیا، چھپا بھی بہت ہے، اس وقت ایک محدود تعداد میں یہاں ہے لیکن وہ فروخت کے لئے نہیں ہے، مفت تقسیم کے لئے ہے، مگر تعداد محدود ہونے کی وجہ سے طے یہ کیا گیا ہے کہ جو شخص کم از کم دو روپے مالیت کی انجمن کی کوئی اور کتاب خریدے گا، اسے یہ کتابچہ بلا قیمت دیا جائے گا۔ اس کتابچہ میں میں نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کیونکہ شہادتِ عثمانؓ تاریخ اسلامی کا سب سے زیادہ اندوہناک واقعہ ہے۔ غیروں نے حضرتِ عثمانؓ پر جو ظلم کئے اور جو ستم ڈھائے اُن کا تو میں ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ حد یہ ہے کہ خود اپنوں نے بھی اُن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اقربا پروری، بیت المال کے سلسلے میں بے احتیاطی وغیرہ کے الزامات لگائے گئے۔ یہ الزامات اس عثمانؓ پر لگائے جا رہے ہیں جن کے عقد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں دیں اور فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو بھی یکے بعد دیگرے عثمانؓ کے نکاح میں دیتا چلا جاتا۔ یہ وہ عثمانؓ ہیں جن کے متعلق حضور فرماتے ہیں کہ "ہر شخص کا ایک رفیق ہوتا ہے اور عثمانؓ میرا جنت کا رفیق ہے۔" جن کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ فرشتے بھی اُن سے حیا کرتے ہیں۔

غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نقد اور اونٹوں اور گھوڑوں کی صورت میں امداد پر اس قدر خوش ہوئے کہ اُن کی دی ہوئی اشرفیوں کو اُچھالتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اس کے بعد عثمانؓ جو چاہے کرے اُس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ غزوۂ تبوک کا دوسرا نام جیش عسرۃ ہے۔ چونکہ ان دنوں مسلمانوں کی حالت بہت پتلی تھی، دُور دراز کا سفر اور رُومیوں جیسی طاقت کا سامنا تھا۔ آپ نے چندہ کے لئے اپیل کی۔ پہلے حضرت عثمانؓ سو اونٹ مع ساز و سامان پیش کئے، حضورؐ خوش ہوگئے۔ مگر فرمایا کہ سو اونٹوں سے کیا بنتا ہے۔ اپیل جاری رہی۔ حضرت عثمانؓ ہر بار سو اونٹ پورے ساز و سامان سمیت دیتے چلے گئے تا آنکہ تعداد تین سو اونٹ تک پہنچ گئی۔ پھر بھی اپیل جاری رہی۔ اس پر انہوں نے ایک ہزار اشرفی لاکر حضورؐ کے سامنے ڈھیر کر دی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ کا چہرہ فرطِ مسرت سے اس طرح سُرخ ہوگیا جیسے کسی نے آپؐ کے رخساروں پر انار نچوڑ دیئے ہوں۔ آپ نے فرمایا: "اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہوں تو بھی اُس سے راضی ہو جا۔" وہ عثمانؓ جو کامل الحیاء والایمان ہیں اُن پر ایسی تہمت؟ لُطف یہ کہ خود لکھتے ہیں کہ جب وہ بلوہ اپنے عروج

پر تھا، حضرت علیؓ بلوائیوں کے سامنے آئے اور اُن تمام الزامات کا جو انہوں نے حضرت عثمانؓ پر لگائے تھے، ایک ایک کرکے جواب دیا اور انہیں غلط ثابت کیا۔ اس کے بعد خود بھی انہی الزامات کو دُہرا رہے ہیں ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

ہمارے مرزا منوّر صاحب نے بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ اُن صاحب نے بھی شاید حضرت علیؓ کو کرائے کا وکیل سمجھا جو فیس لے کر حضرت عثمانؓ کی وکالت کر رہے تھے اگر حضرت علیؓ کی طرف سے کسی غلط بات کا امکان نہیں تو پھر تمام الزامات کی ذمّہ داری خود انہوں نے بکھیر دیں، اب کون سے الزامات لے کر آئے ہو؟

کہا جاتا ہے کہ وہ کمزور تھے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ بوالعجبی کوئی ممکن نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ کمزور آدمی کو غصّہ بہت جلد آتا ہے، وہ قوی انسان ہوتا ہے جسے غصّہ نہیں آتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ:

لیس الشدید بالصرعة	پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے
انّما الشدید الذی یملك	پہلوان وہ ہے جو غصّے کے وقت اپنے آپ
نفسه عند الغضب!	پر قابو رکھ سکے!

— کمزور آدمی کے ہاتھ اگر طاقت آجائے تو وہ کیا کچھ نہ کرے گا، اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ ہے، پچّاس دن کا محاصرہ، ایک دو دن کی بات نہیں — پانی تک بند ہو چکا ہے۔ وہ بیئر رومہ جو حضرت عثمانؓ نے اپنے پیسوں سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا۔ کیونکہ وہ یہودیوں کی ملکیت تھا اور مسلمانوں کو وہاں سے پانی حاصل کرنے میں بڑی دقّت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مُنہ مانگے دام دے کر خریدا اور وقف کر دیا۔ اس کا پانی خود ان پر بند ہے۔ محاصرے کی شدّت کا یہ عالم کہ حضرت اُمّ حبیبہؓ کی کچھ امانتیں حضرت عثمانؓ کے پاس تھیں، وہ واپس لانی تھیں وہ انہیں لانے کے لئے جانے لگیں تو ساتھ ہی ایک مشکیزہ پانی کا بھی لے لیا۔ مگر اس مشکیزے میں بھی چھید کر دیئے گئے اور پانی بہا دیا گیا۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ کی بے عزّتی بھی کی گئی۔ ان حالات میں حضرت عثمانؓ ایک فیصلہ کر کے اس پر ڈٹے ہوئے ہیں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے اور اپنی حفاظت میں کسی کلمہ گو مسلمان کا خون نہیں بہاؤں گا۔ کوئی کمزور آدمی اس طرح ڈٹ سکتا ہے۔ سوچئے اس کے لئے کیسی عزیمت چاہیئے۔ کیسی پختہ اور قوی قوّتِ ارادی درکار ہے۔ پھر یہ معلوم بھی ہے

کہ یہ عثمانؓ کون ہیں۔ قرآن مجید میں ذوالقرنین کا ذکر بڑی شان و شوکت کے ساتھ آیا ہے۔ مطلع الشمس اور مغرب الشمس تک ان کی مہم جوئی کا ذکر ہے۔ اس کے باوجود اُن کی حدودِ مملکت، حضرت عثمانؓ کی مملکت کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں۔ اتنی وسیع و عریض مملکت کا فرماں روا، اتنے بڑے بڑے جرنیل و مُدبّر شام میں حضرت معاویہؓ، مصر میں عمرو بن العاص ان کے ماتحت ہیں اور لجاجت و اصرار سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمیں ان بلوائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت دیں۔ مسلمانوں کی فوج اب ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ بلوائی صرف چند ہزار تھے، فوج کشی کا اشارہ بھی کر دیتے تو ان بلوائیوں کی تکا بوٹی ہو جاتی، مگر نہیں بلوائی اپنی تمام تر شرارتوں کے باوجود بظاہر کلمہ گو ہیں۔ محمدؐ رسول اللہ کا قانون ہے کہ:۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ" ڈھال ہے۔ اس ڈھال پر کسی کلمہ گو مسلمان کی تلوار نہیں اُٹھ سکتی۔ یہ ڈھال کسی نے سچی اُٹھائی ہے یا جھوٹی اٹھائی ہے۔ اس کا فیصلہ تم دُنیا میں نہیں کر سکتے، یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ایک جنگ میں حضرت اُسامہؓ نے ایک کافر پر تلوار اُٹھائی، اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا۔ مگر اُٹھی ہوئی تلوار رُک نہ سکی، وہ قتل ہو گیا۔ غالب خیال یہی تھا کہ اُس نے جان بچانے کے لئے جھوٹ موٹ کا کلمہ پڑھا ہوگا۔ حضور کو علم ہوا تو انہوں نے سخت سرزنش فرمائی اور کہا اُس وقت کیا کرو گے جب قیامت کے دن اُس شخص کا کلمہ تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ میرے ہوتے اسے قتل کر دیا — تو کلمہ کی یہی ڈھال بلوائیوں کے پاس تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اس پر وار نہیں کیا، سارے وار اپنی ذات پر لئے کہ میرا خون تمہیں مطلوب ہے تو حاضر ہے۔ اپنی مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون نہیں بہاؤں گا۔ حضرت علیؓ بار بار کہہ رہے ہیں کہ اجازت دیجئے۔ انصار کی طرف سے وفد بن کر حضرت زید بن ثابت آئے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اللہ کا مددگار بننے کا موقع دیجئے۔ ہم نے اللہ کے رسولؐ کی مدد کی تھی اور اب خلیفۂ رسول کی مدد کرنا چاہتے ہیں، اجازت دیں۔ مگر اُدھر سے ایک ہی جواب ملتا ہے کہ: "اَمَّا الْقِتَالَ فَلَا!" کہ جنگ کی تو اجازت نہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کمزور انسان تھے۔

حضرت عبداللہ بن سلام یہود میں سے تھے، ایمان لا چکے تھے، بہت بڑے عالم

تھے۔ وہ آئے اور محاصرہ کرنے والے بلوائیوں سے اجازت مانگی کہ مجھے بھی عثمانؓ سے ملنا ہے کیونکہ انہیں بھی کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ خوش ہوئے سمجھے کہ اپنا ہی آدمی ہے۔ کہا کہ اچھا جاؤ، مل لو۔ چنانچہ یہ گئے، گفتگو ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے شکوک و شبہات ختم ہو گئے۔ معاملہ پورے کا پورا سامنے آ گیا، حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ اب انہوں نے واپس آ کر ایک خطبہ دیا ہے کہ اے لوگو! میں نے اللہ کی کتاب پڑھی ہے تورات میں ایک بات لکھی ہے آج اُس کے حوالے سے میں تمھیں خبردار کر رہا ہوں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اُس کے ساتھ ستر ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں اور نہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی کے کسی خلیفۂ برحق کو قتل کیا گیا ہو اور کم از کم ۳۵ ہزار انسان اُس کے بعد قتل نہ ہوئے ہوں۔ اللہ کی نگاہوں میں یہ قیمت ہے نبی اور اس کے خلیفہ کی ـــــ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے بعد یہودیوں پر بہ ما بائیٹس رُومی مسلط کیا گیا تھا۔ ایک لاکھ تیس ہزار یہودی قتل ہوئے۔ لہٰذا باز آجاؤ، خونِ عثمانؓ اپنی گردن پر نہ لو۔ انہوں نے کہا، یہ بڈھا یہودی پاگل ہو گیا ہے، اسے نکالو۔ یہ عالم تھا اس وقت مخالفت کا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خون کے اِن پیاسوں کو خطاب کیا اور بتایا کہ مسلمانو! میں نے جس دن سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، اس کے بعد میری زندگی میں کوئی ایسا جمعہ نہیں گذرا کہ میں نے ایک غلام کو آزاد نہ کیا ہو ـــ اور اگر کسی جمعہ کو ایسا نہ کر سکا تو اگلے جمعہ کو اس کا فدیہ دیا اور ایک کی بجائے دو غلام خرید کر آزاد کئے۔ میرے احترامِ رسالت کا یہ عالم ہے کہ جو ہاتھ میں نے بیعت کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیا تھا اسے کبھی اپنی شرمگاہ کو نہیں لگایا۔ مگر کانوں پر پردے پڑے تھے، ہر صدا اُن سے ٹکرا کر واپس آجاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہید کر دیئے گئے۔ یہ ہے اصل میں مظلومیت کی شہادت۔ اس پہ پردے ڈال دیئے گئے اور افسانے گھڑے گئے۔ پچاس دن کا یہ گھیراؤ (BLOCKADE) کوئی معمولی چیز نہیں پانی تک بند کر دیا گیا۔

کربلا کے بارے میں تو محققین ثابت کر رہے ہیں کہ ۹ ر سے پہلے وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اور ۱۰ ر کو شہادت ہو گئی۔ اس لئے پانی کی بندش کی کہانیاں من گھڑت ہیں

مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ۷ ہزار کو پہنچے، چار دن رہے، چار دن پانی کی پیاس کتنی کچھ ہو سکتی ہے۔ دجلہ کا کنارا ہے، زمین میں پانی اتنا قریب ہے کہ ذرا گڑھا کھود دیئے تو پانی نکل آتا ہے ــــ اور تاریخ سے ثابت ہے کہ گڑھے کھودے گئے اور پانی نکلا۔ مگر اس کے باوجود یہ سب کچھ کیا ہے، درا صل شہادتِ عثمان پر پردے ڈالے گئے۔ حضرتِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ یقیناً ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ اُن کی شہادت ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ لیکن نسبت و تناسب کو دیکھئے ایک شخص میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے قتل ہوا ہے: "یَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ!" ــــ

"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ٭ رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے!"

حضرت حسین رضؓ نے اپنی شہادت کے جوہر دکھائے۔ پھر یہ کہ اس وقت ان کے پاس حکومت نہیں تھی اور یہاں جیسا کہ میں عرض چکا ہوں کہ عثمان رضؓ اتنی بڑی سلطنت کے فرمانروا ہیں جو ذوالقرنین کی مملکت سے تین گنا بڑی ہے۔ شمالی افریقہ کے مغربی ساحل سے چلیے اور بلخ و بخارا تک چلے جائیے۔ یہ ہیں ان کی سلطنت کے حدود۔ لاکھوں کی فوج، جب چاہیں وہ آجائے۔ مگر پھر کس مظلومیت کے ساتھ قتل ہوئے ہیں کہ کسی کلمہ گو کے قتل کا داغ اپنی گردن پر لے کر نہیں مرے۔ کوئی باہم نسبت ہے؟ لیکن اس شہادت کے جاننے والے سُنّی کتنے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک سے ایک شہادت بڑھ کر ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کچھ کم ہے؟ وہ اسداللہ واسدرسولہ ہیں۔ پھر حضرت سُمَیّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت کیا کم ہے۔ یہ وہ پہلا خون ہے جو اللہ کی راہ میں بہایا گیا۔ تو یہ سب شہادتیں چمنِ نبوی کے پھول ہیں ایک سے ایک اعلیٰ، ایک سے ایک عمدہ۔ حق کی گواہی، صداقت کی گواہی، عدل کی گواہی، خیر کی گواہی، دین کی گواہی، قرآن کی گواہی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی میں گردنیں کٹوانا اِس اُمّت کا مقصدِ وجود ہے۔ اس کو کہانی اور افسانہ بنا دینا سارے دین کو اس کے گرد چکّر دے دینا، اُس کے گرد انسان پرستی کے ہالے بُن دینا یہودیت ہے اور یہودیّت سازش ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کہنے والا پیدا نہیں ہوا لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا کہنے والے پیدا ہو گئے۔ کسی کے ساتھ نسبت ہے کوئی ذہن اس کے پیچھے ہے۔ وہی عیسائیوں والی تثلیث یہاں بھی آ گئی۔ حضرت مریم کی

جگہ حضرت فاطمہؓ کو دے دی گئی اور اس طرح تثلیث مکمل ہو گئی۔ آخری دن جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی ہے، بیس غلام اُن کی ملکیت میں تھے۔ ان سب کو بلا کر کہا کہ تم سب آزاد ہو۔ ساری عمر کبھی شلوار نہیں پہنی تھی۔ اب شلوار منگوائی مبادا شہادت کے وقت ستر کھل جائے۔ حیا کا یہ عالم تھا۔ پھر اس شلوار کو کس کر باندھا اور اس طرح شہید ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہ اچانک حادثہ ہو گیا ہو۔ روزہ رکھا ہوا ہے، قرآن مجید پڑھ رہے ہیں، فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر پہنچے تھے کہ شہید ہوئے، ان الفاظ پر خون گرا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جو فرمایا تھا وہ سچا ثابت ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چودہ سو اسی ہزار مسلمان تلواروں، نیزوں، اور تیروں کا شکار ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی کی نذر ہو گیا ــــ!!

حضرت حسنؓ کا ایک بہت پیارا خواب ہے۔ حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت ہے۔ حضرت حسنؓ نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے رات خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش کا ایک پایہ تھامے کھڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آتے ہیں اور حضورؐ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں اچانک حضرت عثمان ذوالنورینؓ حاضر ہوتے ہیں، اُن کا کٹا ہوا سر اُن کے ہاتھوں میں ہے اور وہ فریاد کرتے ہوئے آتے ہیں کہ اے اللہ! اپنے رسولؐ کی اُمت سے پوچھ! اِس نے کس جرم کی پاداش میں مجھے شہید کیا:۔ "بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلْتُ!" (میں کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا ہوں؟) اس پر عرشِ الٰہی تھرّاتا ہے اور زمین کی طرف خون کے دو پرنالے جاری ہو جاتے ہیں۔ خون کے یہ دو پرنالے جنگِ صفین اور جنگِ جمل ہیں جن میں مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون بہا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ اس کو اس CONTEXT میں سمجھئے جسے علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ع "تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!" چنانچہ اب وہ سیلِ رواں تھم گیا ــــ کوئی بیرونی قوت اسے روکنے والی نہ تھی، اسے INTERNAL SABOTAGE نے روکا۔ باہر سے کون روک سکتا تھا۔ سلطنتِ روما کی ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں، سلطنتِ کسریٰ

نیست و نابود ہو چکی تھی۔ اب اور کون سی طاقت رہ گئی تھی جو مزاحم ہو سکتی۔ یہ INTERNAL SABOTAGE ہے جو روکتا ہے اور ایسا روکا ہے کہ آج تک رکا ہوا ہے۔ یہ تو میری اگلی تقریر کا موضوع ہوگا کہ کیسے روکا ہے۔ اس لئے کہ بعد کی تاریخ، تاریخ اسلام نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ خلافتِ راشدہ ختم ہو چکی، خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ جو اللہ کے آخری رسول کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل تھی، ختم ہو گئی۔ اگرچہ ہماری تاریخ کا یہ دَور بھی ایسا نہیں ہے کہ ہم اس پر بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ اس دَور میں بھی مسلمانوں نے بڑی اعلیٰ حکومتیں قائم کیں، بڑے اعلیٰ حکمران پیدا کئے۔ تہذیب بھی ہے، تمدّن بھی ہے، علوم بھی ہیں، فنون بھی ہیں۔ بہت اعلیٰ دَور ہے، مملکتوں کے مقابلے میں مملکت، سلطنتوں کے مقابلے میں سلطنت، بادشاہوں کے مقابلے میں بادشاہ۔ اس اعتبار سے بھی تقابل کیجئے تو اس کی بھی نظیر آپ کو نہیں ملے گی۔ لیکن جو چیز ختم ہو گئی وہ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ ہے کہ وہ نظام برپا ہی اس مقصد کے لئے ہوا تھا کہ پیغام رسالت محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کو پہنچانا ہے۔ یہ ہے اصل غرض و غایت اور مشن خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا۔ یہ خلافت کہاں ختم ہوئی؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے، اختلافی بھی ہو سکتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تیس سال تک خلافتِ راشدہ کا عرصہ ہے۔ اس کو سامنے رکھئے تو حضرت حسنؓ کی خلافت کے خاتمے پر وہ وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے خُلفائے راشدین یہ ہوئے: حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ۔ لیکن صحاح ستّہ ہی میں ایک اور روایت بھی ملتی ہے کہ جس میں بارہ خلفاء کا ذکر ہے اور ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ "کُلّھم مِن قُرَیشٍ" کہ یہ امر بارہ خلفاء تک جاری رہے گا۔ جنھوں نے یہ تعداد بتائی ہے وہ اسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تک لے جاتے ہیں۔ اس دَور میں حضرت حسنؓ، حضرت معاویہؓ، بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تک بنو اُمیّہ کا پورا ابتدائی دَور بھی آجاتا ہے۔ بہرحال یہ وہ بات ہے جو امام الہند شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے کہی۔ اور وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ وقیع اور مدلّل ہے۔

یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ خلیفۂ راشد کی اپنی ذات اور اس نظام کو جو قائم ہے، دونوں کو جُدا جُدا کر کے سوچنا پڑے گا۔ اپنی ذات کے اعتبار سے تو حضرت امیر معاویہؓ

بھی صحابی ہیں: "والصحابة کلّھم عدول!" ان کے بارے میں کسی بدنیتی کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اگر کسی کو ہے تو اس کا ایمان سلامت نہیں ہے۔ حضرت عمرو بن العاص یا حضرت ابوموسیٰ اشعری کے متعلق جسے بدنیتی کا شبہ ہے وہ ایمان کی خیر منائے، انفرادی سطح پر حضرت علیؓ کا کیا کہنا، ہمارے نزدیک بھی تین افراد کے سوا پوری اُمّتِ مسلمہ میں افضل ترین انسان ہیں۔ سوچیے تو سہی! کوئی لمبا چوڑا فرق تو نہیں۔ ہمارے نزدیک بھی افضل ترین ہیں سوائے تین افراد — ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کے۔ ان کے بعد حضرت علیؓ پوری اُمّت میں افضل ترین انسان ہیں۔ کوئی شخص آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے افضل سمجھتا ہو، ناممکن ہے، قرآنی نصوص کے خلاف ہے: (سورۃ الحدید آیت ۱۰)

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

نہیں برابر تم میں سے وہ شخص کہ جس نے خرچ کیا تھا پہلے فتح مکّہ سے اور لڑائی کی تھی۔ یہ لوگ بڑے ہیں درجوں میں اُن لوگوں سے کہ خرچ کیا انہوں نے پیچھے اس سے اور لڑائی کی اور ہر ایک کو وعدہ دیا ہے اللہ نے اچھا اور اللہ ساتھ اس چیز کے کہ کرتے ہو تم خبردار ہے!

قرآن مجید کی صریح نص ہے۔ لیکن حضرت معاویہؓ یا حضرت عمرو بن العاص کے بارے میں بددیانتی کا کوئی شائبہ نہیں ورنہ اس کی زد پڑے گی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر، تو جب ان دونوں چیزوں — خلیفۂ راشد کی ذات اور اُس کے عہد میں قائم نظام کو جذب کریں گے تو ایک عجیب بات سامنے آتی ہے۔ خلافتِ راشدہ ختم ہوگئی شہادت حضرت عثمانؓ پر۔ اُن کے بعد خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی خلافت کا ساڑھے چار سالہ دور باہمی خانہ جنگی کا دور ہے۔ اس محمّدی مشن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ایک انچ زمین حدود بلادِ اسلامیہ میں شامل نہیں ہوئی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

دوسری بڑی حقیقت جس کو شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کی اوّلین خصوصیت اُمّتِ مسلمہ کا مجتمع رہنا۔ مگر حضرت علیؓ کے پورے دورِ خلافت میں اُمّت یکجا نہ ہوسکی، باہم بٹی رہی۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاص

نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی- ایک پورا علاقہ اور پورے کے پورے ممالک ان کی بیعت سے خالی ہیں- تو یہ جو اُمّت کا جمع ہو جاتا ہے، وہ موجود نہیں- لیکن اس کا کوئی الزام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات پر نہیں ہے- نعوذ باللہ من ذالک ثمّ نعوذ باللہ من ذالک- ردِّ عمل کے طور پر ہمارے ہاں ایک خیال پیدا ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں کچھ لوگوں کو حضرت علیؓ سے بغض ہو گیا ہے- گو ہے ردِّ عمل کے طور پر لیکن یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہے- یہ بھی یہودیت کا شاخسانہ ہے، یہ دو دھاری تلوار ہے دیکھئے غور کیجئے! اگر حضرت عثمانؓ کے بارے میں بدظن ہوئے تو بھی اُن کے پو بارہ اور اگر حضرت علیؓ سے بدظن ہوئے تو بھی ان کے پو بارہ، انہیں کوئی گھاٹا نہیں- گھاٹا دونوں اعتبارات سے اُمّتِ مسلمہ کا ہے- حقیقت میں وہ بھی اُمّتِ مسلمہ کے گلِ سرسبد ہیں اور یہ بھی اُمّتِ مسلمہ کے گلِ سرسبد ہیں- یہ بھی تربیتِ محمدیؐ کے شاہکار ہیں اور وہ بھی تعلیم و تزکیۂ محمدیؐ کے شاہکار ہیں- انہیں مجروح کرتے ہو تب بھی محمدؐ کی نبوت پر حرف آتا ہے اور انہیں مجروح کرتے ہو تب بھی رسالتِ محمدیؐ پر بار پڑا- گویا کہ ان کی دونوں طرف سے جیت ہو رہی ہے- یہ ہے وہ کیفیت ع

"کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!"

یہ دو دھاری تلوار ہے جس سے ہم مارے جا رہے ہیں- معتدل رائے یہی ہے کہ جو منافقات ہوئے ان میں کسی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں- صرف غیروں کا ڈالا ہوا پیچ تھا جو اس عیاری کے ساتھ ڈالا گیا کہ انتہائی خلوص کے باوجود حل نہیں ہوا- لیکن الزام نہ حضرت عثمانؓ پر آتا ہے نہ حضرت علیؓ پر، نہ حضرت معاویہؓ پر نہ حضرت عمرو بن العاصؓ پر اور نہ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر، کیونکہ "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُولٌ"- پیچیدگیاں واقعتاً پڑی ہیں مگر ڈالی اغیار نے ہیں اور اس طرح ڈالی ہیں کہ ان کا حل ممکن نہ ہوا- یہ بات ذہن میں رکھئے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے باہمی اختلاف کے بارے میں اہلِ سنّت کا تقریباً اجماع ہے کہ حضرت معاویہؓ کی غلطی تھی لیکن غلطی اور بات ہے اور بدنیتی اور بات- ان دونوں کو بالکل ایک دوسرے سے جدا رکھیں- ہمارا موقف یہ ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ نبی کے سوا معصوم کوئی نہیں ہوتا- خطا ہو سکتی ہے، غلطی ہو سکتی ہے- وہ غلطی ابو بکرؓ سے بھی ہو سکتی ہے، عمرؓ سے بھی ہو سکتی ہے

عثمانؓ سے بھی ہو سکتی ہے، حضرت علیؓ سے بھی ہو سکتی ہے، حضرت معاویہؓ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اجتہادی غلطی پر بھی اجر ملتا ہے۔ نیک نیتی سے آپ نے ایک فیصلہ کیا اگرچہ غلط ہو گیا مگر اس میں نیت کے اخلاص پر بھی اجر ہے۔ یہ ہے اہل سنت کا موقف اس اعتبار سے اُن کے اور اہل تشیع کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہے! ان کے نزدیک حضرت علیؓ حق پر تھے اور معصوم تھے اور معصوم کے مقابلے میں جو آیا وہ ...

...... میں تو وہ الفاظ زبان پر بھی نہیں لانا چاہتا۔ لیکن ان کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا تو اسلام بھی معتبر نہیں — اہل سنت کا موقف بالکل اور ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ معصوم نہیں، خطا اُن سے بھی ہو سکتی تھی، خطا ان سے بھی ہو سکتی تھی۔ اس پہلو سے اگر کوئی کہتا ہے کہ خطا حضرت معاویہؓ کی تھی، اگرچہ بدنیتی نہ تھی تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر کوئی کہے کہ نہیں غلطی حضرت علیؓ کی تھی تو وہ FACE VALUE پر اور FACTS کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ معصومیت نہ اِدھر حائل ہے نہ اُدھر (میں صرف دو منٹ اور لے رہا ہوں! وقت بہت ہو گیا!) پھر ایسا تھا کہ حضرت علی کا فرمان یہ تھا کہ معاویہ! پہلے تم بیعت کرو، پھر میں قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لوں گا۔ آپ بتائیں اس میں کیا غلطی ہے؟ حضرت معاویہؓ کو نظر یہ آرہا ہے، — وہ یہ DEFACTO SITUATIOM دیکھ رہے ہیں کہ قاتلینِ عثمان اس وقت حضرت علی پر چھائے ہوئے ہیں۔ جوں ہی میں نے بیعت کی، میری گردن تو سلامت نہیں رہے گی۔ آگے قاتلینِ عثمان پر کچھ ہوتا ہے یا نہیں؟ نظر نہیں آتا۔ یہ بھی FACT ہے۔ یہ ہے وہ چکر — کیا کریں۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا جو صورتِ حال ہے اس کو BLAME کیجئے۔ نہ حضرت علی کو کیجئے نہ حضرت عثمان کو اور نہ حضرت معاویہ کو۔ اغیار کا ڈالا ہوا پھیر اور پھندا ایسا تھا جو حل نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ایک قوم اور ایک بہت بڑی نامزد مملکت کے اعتبار سے، تاریخ کا آغاز ہو گیا۔ اب اس اختتامِ خلافتِ راشدہ سے تنسیخِ خلافت تک جو اس صدی کے آغاز میں ہوئی، کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر ان شاء اللہ اگلی جمعرات کو گفتگو ہو گی ٭

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ○

مختصر روداد

ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس

از قلم :- قاضی عبدالقادر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس ۱۸ تا ۲۱ اپریل ۸۰ء لاہور میں منعقد ہوئی۔ ۱۸ تا ۲۰ اپریل تین روز کے اجلاس شہر کے مرکزی مقام جناح ہال (سابق ٹاؤن ہال) میں اور ۲۱ اپریل کے اجلاس قرآن اکیڈمی (ماڈل ٹاؤن) میں منعقد ہوئے۔ پہلی سالانہ قرآن کانفرنس دسمبر ۷۳ء میں اور دوسری تیسری اور چوتھی کانفرنسیں بالترتیب ۷۵ء، ۷۶ء اور ۷۷ء میں لاہور میں جناح ہال ہی میں منعقد ہوئی تھیں۔ لیکن پانچویں اور چھٹی کانفرنسوں کا انعقاد ۷۸ء اور ۷۹ء میں کراچی کے آئی۔ بی۔ اے ہال میں ہوا تھا۔ یہ ہے مختصر تاریخ ان سالانہ قرآن کانفرنسوں کی جنھوں نے ملک کی دینی اور سماجی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ مقصد ان کانفرنسوں کا یہ رہا ہے کہ ایک طرف قرآن حکیم کے اعجاز اور اس کی عظمت کا بیان کیا جائے اور دوسری جانب عصر حاضر کے اقتصادی معاشرتی سیاسی، قانونی، دستوری، ثقافتی اور تہذیبی مسائل کا قرآنِ حکیم کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے اور اُن کا حل تلاش کیا جائے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ ہم نے ان قرآن کانفرنسوں کے ذریعے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء و فضلاء اور ملک کے چوٹی کے اہل علم اور دانشور حضرات کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس لئے کہ قرآنِ حکیم ہی وہ 'حبل اللہ' ہے جو نہ صرف ہمارے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے بلکہ وہ اتحاد کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو 'حبل اللہ' سے اعتصام کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس سال بعض وجوہات کی بنا پر قرآن کانفرنس کی تاریخیں کئی بار تبدیل کی گئیں مرکزی انجمن خدام القرآن کی مجلسِ منتظمہ نے اپنے اوّلین فیصلہ میں اس کی تاریخیں ۲۱ر تا ۲۳ر مارچ مقرر کیں۔ کیونکہ اس سے قبل عام طور پر یہ کانفرنس مارچ ہی کے مہینہ میں منعقد کی جاتی رہی ہے۔ لیکن جب یہ پتہ چلا کہ یہی تاریخیں دارالعلوم دیوبند کے جشنِ صد سالہ کی ہیں اور پاکستان کے بہت سے علماء و فضلاء اس میں شرکت کے لئے جائیں گے تو تاریخیں تھوڑی سی آگے بڑھا دی گئیں یعنی ۲۳ر تا ۲۷ر مارچ، اور اس کا اعلان بھی 'میثاق' میں شائع کر دیا گیا۔ ابھی یہ اعلان شائع ہوا ہی تھا کہ صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو جشن دیوبند میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا اور بعض حضرات کی جانب سے اصرار بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس میں ضرور شرکت فرمائیں۔ چنانچہ کانفرنس کی تاریخیں مزید آگے بڑھا کر ۴ر تا ۹ر اپریل کر دی گئیں اور اس کا اعلان بھی بذریعہ اخبارات کر دیا گیا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر "عرفت ربی بفسخ العزائم" والا معاملہ ہوا۔ کسی نے بتایا کہ یکم تا ۱۰ر اپریل یونیورسٹی کی تعطیلات ہیں، اور چونکہ ایک روز کے اجلاس قرآن اکیڈمی میں منعقد ہونے تھے اور ان میں نیو کیمپس کے قریب ہونے کی وجہ سے طلباء اور اساتذہ کی شرکت متوقع تھی اس لئے تاریخیں مزید بڑھا دی گئیں۔ یعنی ۱۸ر تا ۲۱ر اپریل اور الحمد للہ ثمّ الحمد للہ کہ کانفرنس ان تاریخوں میں منعقد ہو گئی اور مزید آگے سرکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اجلاس کی تقسیم یوں رکھی گئی تھی کہ ۱۸ر اپریل بروز جمعہ پہلا اجلاس جناح ہال میں صبح ۹ بجے، دوسرا اجلاس بعد نمازِ عصر اور تیسرا اجلاس بعد نمازِ مغرب ۱۹ر اپریل کو دو اجلاس، پہلا عصر تا مغرب اور دوسرا بعد مغرب۔ ۲۰ر اپریل کو صرف ایک اجلاس بعد نمازِ مغرب۔ ۲۱ر اپریل کو قرآن اکیڈمی میں دو اجلاس پہلا ½۸ تا ۱۰ بجے صبح اور دوسرا ½۱۰ تا ۱ بجے دوپہر۔ قرآن اکیڈمی ہی میں بعد نمازِ مغرب حسنِ سماعت (محفلِ سماعِ مسنون یعنی قرأت قرآنِ حکیم) اور حسنِ بصارت (سورۂ رحمٰن کے مناظر کی فلم) کے پروگرام۔

قرآن کانفرنس میں شرکت کے لئے جہاں پنجاب کے مختلف شہروں سے لوگ آئے وہاں تقریباً دو درجن افراد پر مشتمل ایک قافلہ کراچی سے بھی شریک ہوا

اس کانفرنس کی ایک خصوصی بات یہ تھی کہ علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے نہ صرف کانفرنس کے لئے اپنا پیغام ارسال فرمایا بلکہ یونیورسٹی کی جانب سے کانفرنس میں شرکت کے لئے مندوب بھی بھیجے۔ چنانچہ جو حضرات علی گڈھ سے تشریف لائے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ① پروفیسر اختر الواسع صاحب شعبۂ اسلامیات اور ② ڈاکٹر عبد الغفار شکیل صاحب شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات مولانا محمد تقی امینی صاحب جو برِّ صغیر کے ممتاز عالم دین اور بلند پایہ مصنف ہیں، کو بھی یونیورسٹی کے مندوب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرنا تھی اور وہ اس کے لئے بہت مشتاق بھی تھے، ان کے پاسپورٹ اور ویزا کے مرحلے بھی بہت کم وقت میں طے ہو گئے۔ انہیں اور ڈاکٹر شکیل صاحب کو علی گڈھ سے ایک ہی ریل گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ڈاکٹر شکیل صاحب گاڑی کے آنے سے خاصے قبل اسٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی آئی وہ مع سامان سوار بھی ہو گئے لیکن انتظارِ بسیار کے باوجود ان کے بقول مولانا محمد تقی امینی صاحب اسٹیشن نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ وہ مع سامان کے گاڑی سے اُتر گئے ـــــ مولانا امینی صاحب ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچے۔ چلتی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ سمجھ کر کہ ڈاکٹر شکیل صاحب بھی گاڑی میں کہیں نہ کہیں موجود ہی ہوں گے۔ دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہو ہی جائے گی۔ اب ڈاکٹر شکیل صاحب مولانا کا انتظار علی گڈھ اسٹیشن پر کر رہے ہیں اور مولانا تقی امینی صاحب دہلی کے اسٹیشن پر اترتے ہوئے مسافروں میں ڈاکٹر صاحب کو تلاش کر رہے ہیں۔ مایوس ہو کر ڈاکٹر شکیل صاحب دوسری گاڑی سے علی گڈھ سے دہلی روانہ ہوئے اور مولانا تقی امینی صاحب دہلی سے علی گڈھ؟ اور یوں ڈاکٹر عبد الغفار شکیل صاحب لاہور پہنچ گئے اور مولانا تقی امینی صاحب جہاں سے چلے تھے وہیں واپس یعنی علی گڈھ ـــ اس لئے کہ مولانا اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے پیشِ نظر دہلی سے لاہور تک کا سفر تنہا کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ سفر سے اسی طبعی عدم مناسبت کے باعث مولانا دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں بھی شرکت نہ

فرما سکے تھے ـــــ بہرحال ہماری آنکھیں مولانا محترم کی لاہور میں ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترستی ہی رہیں۔

اب آپ کی خدمت میں کانفرنس کے پروگرام کی مختصر الفاظ میں رُوداد پیش کی جاتی ہے۔

۱۸ر اپریل | پہلا اجلاس صبح ۹ بجے جناح ہال میں منعقد ہوا۔ جس کا موضوع تھا "عظمتِ قرآن" قاری عبدالقیوم صاحب کی تلاوتِ کلامِ پاک سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے افتتاحی کلمات کے بعد اسٹیج پر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے مندوب پروفیسر اختر الواسع تشریف لائے۔ آپ نے شروع میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علی گڈھ کے چند روزہ قیام کے دوران کس طرح اپنی قرآنی فکر سے وہاں کے اہلِ علم طبقے کو متاثر کیا۔ انہوں نے کہا علی گڈھ ہر وقت ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہے۔ بعد ازاں انہوں نے علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع صاحب کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جو موصوف نے ان کے ہاتھ ارسال فرمایا تھا۔ پیغام کا متن حسبِ ذیل ہے:

"آج مسلمان جن خطرات سے دوچار ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان خطرات سے بچنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں لیکن سب سے زیادہ ملّتِ اسلامیہ کے مزاج کے مطابق وہی تدبیر ہے جسکی طرف یہ کانفرنس لوگوں کو متوجہ کر رہی ہے یعنی قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔

قرآن اللہ کی کتاب ہے اس کی عظمت و بلندی کے لئے اللہ کی طرف اس کی یہ نسبت کافی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملّتِ اسلامیہ نے جو کچھ پایا اس کی بدولت پایا اور جو کھویا اس کو چھوڑنے کی وجہ سے کھویا۔ یہ زندگی کا سرچشمہ ہے، ملّت کی تقدیر اس میں پوشیدہ ہے۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی وہ بات ضرور یاد دلاؤں گا جو انہوں نے مالٹا کی قید سے واپس آکر علماء کے اجتماع میں فرمائی تھی، وہ یہ کہ:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا

میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اب قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے، اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات ختم کرنے میں صرف کروں گا!"

اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد اس تناقضِ فطرت نے ہمیں جو رہنمائی دی، "قرآن کانفرنس" کے نام وہی میرا پیغام ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ — یہ کانفرنس نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ کامیاب ہو۔ آمین — !!"

اس اجلاس کی صدارت کے لئے پیر کرم شاہ صاحب بھیروی (جامعہ ازہر) کو دعوت دی گئی تھی۔ لیکن موصوف نے معذوری کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ حافظ نذر احمد صاحب پرنسپل شبلی کالج و مہتمم ادارۂ تعلیم القرآن (بذریعہ خط و کتابت) کو زحمت دی گئی جس کا اعلان بھی ایک روزہ قبل بذریعہ اخبارات کر دیا گیا تھا۔ مقامی اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات حسبِ سابق پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ کی جانب سے شائع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ادارہ کے منتظمین کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین — !!

حافظ نذر احمد صاحب کی زیرِ صدارت اس اجلاس میں سب سے پہلے پروفیسر اختر الواسع صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ اُن کے بعد ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ موصوف نے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور کانفرنس میں شرکت کے لئے کینیڈا سے تشریف لائے تھے۔ آپ نے مولانا منتخب الحق صاحب کے افادات پر مشتمل "صداقتِ قرآن" کے موضوع پر خطاب کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "عظمتِ قرآن بزبانِ قرآن!" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے "قرآنِ مہجور" کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا۔ ان کے بعد پروفیسر مرزا محمد منور صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور "عظمتِ قرآن بزبانِ اقبال" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ حافظ نذر احمد صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حسبِ معمول خطبۂ جمعہ مسجد دار السلام (باغ جناح) میں ارشاد فرمایا۔ خطبہ کا موضوع موقع کی مناسبت سے "عظمت و اعجاز قرآنِ حکیم تھا۔

دوسرا اجلاس بعد نمازِ عصر جناح ہال میں شروع ہوا جس کی صدارت جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب شعبۂ علومِ اسلامی جامعہ پنجاب نے فرمائی۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری صاحب نے انجام دیئے صبح کے اجلاس کے لئے مولانا سید حامد میاں مدظلہ کا نام بھی تھا لیکن موصوف تشریف نہ لا سکے تھے، البتہ اپنا مقالہ "عظمتِ قرآن بزبانِ رسالتمآب ﷺ" بھیج دیا تھا۔ پہلے اجلاس میں اس کو پڑھ کر سنانے کا وقت نہ مل سکا۔ چنانچہ دوسرے اجلاس میں اس مقالہ کو قرآن اکیڈمی کے مولانا محمد حسین میر صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صاحبِ صدر نے "قرآنِ حکیم اور مستشرقین" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش فرمایا اور مغرب کی نماز کے وقت اس اجلاس کی کارروائی ختم ہو گئی۔

مغرب کی نماز باجماعت جناح ہال کے لان میں پڑھی گئی۔ امامت کے فرائض ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے انجام دیئے۔ نماز کے فوراً بعد آج کے دن کے تیسرے اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی۔

ممتاز محقق اور قانون دان جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب جج سندھ ہائی کورٹ جو کراچی سے تشریف لائے تھے، کرسیٔ صدارت پر رونق افروز تھے۔ شریکِ صدارت جناب جسٹس (ریٹائرڈ) قاضی محمد گل صاحب تھے۔ پشاور ہائی کورٹ کے جج جسٹس کریم اللہ دُرّانی صاحب بھی شریکِ اجلاس تھے۔ اس نشست کا موضوع تھا: "اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کے تقاضے"۔ کراچی کے ممتاز قانون دان جناب خالد اسحاق کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے موصوف تشریف نہیں لا سکے۔ انہیں چند روز قبل ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانا تھا، ہو سکتا ہے وہاں ان کی مصروفیت کچھ بڑھ گئی ہو۔ مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے علی گڈھ سے

آنا تھا، لیکن وہ بھی شرکت نہ کر سکے جس کی وجوہات اوپر درج کی جا چکی ہیں۔
یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اپنے گراں قدر مقالہ کی ایک نقل موصوف نے ہمیں بھیج دی تھی۔ اس لئے ان کا مقالہ پروفیسر اختر الواسع صاحب (مندوب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے پڑھ کر سنایا۔ مقالہ کا عنوان تھا: "قرآن کا دستورِ اساسی ہے"۔ ان کے بعد حافظ عبدالرحمٰن المدنی نے: "اسلامی ریاست اور مسئلۂ حاکمیت" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ تقریر نہایت علمی تھی لیکن اس میں پیش کردہ خیالات سے کچھ مغالطے لاحق ہو سکتے تھے۔ چنانچہ حافظ عبدالرحمٰن مدنی کی تقریر کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مائک سنبھالا اور اپنی مختصر تقریر میں ان باتوں کی وضاحت فرمائی جو حافظ صاحب کی تقریر میں اجمالاً بیان کی گئی تھیں اور جن سے مغالطے لاحق ہو سکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بعد موصوف کی تحسین اور تصویب سے پشاور ہائی کورٹ کے جج جسٹس کریم اللہ دُرّانی نے اپنی تقریر کا آغاز فرمایا۔ آپ کی تقریر بہت دلچسپی کے ساتھ سنی گئی۔ تقریر میں دینی لگاؤ اور خلوص کی چاشنی کا عنصر اتنا نمایاں تھا کہ لوگ چاہتے تھے کہ تقریر سنتے ہی رہیں۔ لیکن گیارہ بجے کی فلائٹ سے چونکہ صاحب صدر کو واپس کراچی جانا تھا اس لئے جسٹس دُرّانی کو اس عمدہ پر تقریر ختم کرنا پڑی کہ دوسرے دن بھی وہ خطاب فرمائیں گے۔ جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد آج کے اجلاس کا اختتام ہوا۔

۱۹ اپریل ۸۰ء (بروز ہفتہ) اجلاس اوّل بعد نمازِ عصر تا نمازِ مغرب منعقد ہوا۔ اس کا موضوع تھا: "معاشی و اقتصادی مسائل اور قرآنی حکیم"۔ اور کرسئ صدارت پر رونق افروز تھے جناب ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی۔ قرآن اکیڈمی کے مولینا محمد حسین صاحب میر نے اپنا مقالہ: "قرآن حکیم اور محروم طبقات" پڑھا۔ بعد ازاں جسٹس کریم اللہ دُرّانی صاحب نے تقریر ارشاد فرمائی۔ درمیان میں مغرب کا وقت آگیا۔ چنانچہ نمازِ مغرب کے بعد قاری محمد عارف کی تلاوت کے بعد اجلاس اوّل کے صاحب صدر جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جس کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کا موضوع "قومی و ملّی مسائل اور قرآنِ حکیم" تھا اور اس کی صدارت جناب ڈاکٹر سلیم فاروقی سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور نے فرمائی۔ ڈاکٹر عبدالرؤف ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے

اپنا مقالہ بعنوان: "درسِ قرآن اور تعمیرِ حیات!" پڑھا۔ بعد ازاں خواجہ غلام صادق صاحب چیئرمین ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اپنا مقالہ بعنوان: "قرآنی تعلیمات اور ہم!" پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر بختیار حسین صدیقی (گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن) خود تو تشریف نہ لا سکے البتہ ان کا مقالہ بعنوان: "اسلام کا طریقِ تعلیم!" آ گیا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث سنایا نہ جا سکا۔ ان شاء اللہ العزیز 'میثاق' میں شائع ہو گا۔ ساہیوال کے پروفیسر عبدالمنّان نے: "قرآن حکیم اور فلاحِ انسانی!" کے موضوع پر تقریر ارشاد فرمائی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مندوب پروفیسر اختر الواسع نے مقالہ پیش فرمایا، عنوان تھا: "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!"۔ پروفیسر اختر الواسع صاحب جب تک لاہور نہیں آئے تھے تو 'میثاق' میں ان کا خط پڑھ کر بعض دوستوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی ضعیف العمر شخصیت یا کم از کم ادھیڑ عمر کے تو ہوں گے لیکن جب وہ یہاں تشریف لائے تو ان دوستوں کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ نہ صرف ایک نوجوان ہیں بلکہ ملّت کے مسائل پر سوچنے والا ذہن اور ایک دردمند دل رکھتے ہیں اسی لئے اُن کا مقالہ ان کی خصوصی جذباتی آواز میں بہت پسند کیا گیا۔ ہندوستان میں قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے ہمیں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اجلاس کے آخر میں ڈاکٹر سلیم فارانی صاحب نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، عنوان تھا: "وراثتِ نبوی ؐ کی روشنی میں کیفیتِ ملّی کا جائزہ!"

۲۰ اپریل (بروز اتوار) آج اعلان کے مطابق دو اجلاس منعقد ہونے تھے۔ پہلا بعد نمازِ عصر جس کا موضوع تھا: "قرآن اور سائنس!" اور دوسرا بعد نمازِ مغرب "فلسفہ و حکمت کے مسائل اور قرآنِ حکیم!" کے موضوع پر۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ اب موضوع تھا: "فلسفہ اور سائنس کے مسائل اور قرآنِ حکیم!" اور آج کا یہ واحد اجلاس بعد نمازِ مغرب شروع ہوا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خیرات محمد ابنِ رسا وائس چانسلر جامعہ پنجاب کو کرنا تھی، لیکن وہ اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور مصروفیات کی وجہ سے واپس نہیں آ سکے تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت بلدیہ حیدر آباد (سندھ) کے میئر اور جامعہ اسلامیہ حیدر آباد کے مہتمم مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کو کرنا تھی لیکن ان کا ٹیلیگرام آ گیا تھا کہ اچانک مصروفیت کی بنا پر وہ شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ آج

کے مشترکہ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر بشیر احمد صاحب صدیقی نے فرمائی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری صاحب نے ترکی کے سابق نائب وزیر اعظم اور وہاں کی ملّی سلامت پارٹی کے صدر جناب نجم الدّین اربکان صاحب کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جو آج ہی بذریعہ تار موصول ہوا تھا۔ پیغام کا متن حسب ذیل ہے :

"میں آپ کو ۱۹۷۳ء سے تا حال قرآن کانفرنسوں کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ کو ان مساعی جمیلہ میں کما حقہ' کامیابی حاصل ہو۔ اس لئے کہ آپ کی یہ کوششیں قرآن مجید کے ضمن میں امّتِ مسلمہ کے سوا ارب افراد کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ اُمّتِ مسلمہ کا اتّحاد یقیناً اہم ترین شے ہے۔ میں دُعا گو ہوں کہ اس کانفرنس سے عالمِ اسلام کے مستقبل کے لئے مفید نتائج برآمد ہوں، اور میں ان تمام برادرانِ اسلام کو جو اس کانفرنس میں شریک ہو رہے ہیں سلام مع تہنیت و اکرام پیش کرتا ہوں۔

● کراچی سے تشریف لائے ہوئے پندرہ روزہ "یقین انٹرنیشنل" کے ایڈیٹر جناب خلیق احمد صاحب نے : "تعلیم قرآن اور علم و عمل کی ہم آہنگی !" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے : "قرآن اور سائنس" کے موضوع پر مقالہ پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر ابوبکر صدر شعبۂ علم الحیوانات جامعہ پنجاب نے اپنا مقالہ بعنوان : "نسلِ انسانی اور تقسیم شعوب و قبائل جدید تحقیقات کی روشنی میں !" پیش فرمایا۔ ڈاکٹر رفیع الدّین صاحب مرحوم کی ایک تحریر "سائنسی علوم میں ہماری موجودہ درسی کتابوں کے نقائص !" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نہ صرف پڑھ کر سنائی بلکہ ساتھ ہی اس کی تفہیم بھی پیش فرماتے رہے۔ یہ تحریر دو ورقہ کی صورت میں چھپوا کر اجلاس میں تقسیم [illegible] کی گئی۔ بعد ازاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے اپنا تقریر نما مقالہ یا مقالہ نما تقریر "اسلام کے خلاف ہندو مت کا مدافعانہ ردِّ عمل : بھگتی تحریک" کے عنوان سے ارشاد فرمائی۔ چشتی صاحب کی تقریر کیا ہوتی ہے کہ لوگ بس جھوم جھوم جاتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ سنتے ہی رہیں۔ آخر میں ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد آج کے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

۲۱/ اپریل (بروز پیر) آخری دن کے یہ اجلاس حسبِ اعلان قرآن

اکیڈمی میں منعقد ہوئے۔ قرآن اکیڈمی جس کی تعمیر پر اب تک پندرہ لاکھ روپے سے زائد رقم خرچ ہو چکی ہے، تعمیر کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ امید ہے کہ اس میں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ ان شاء اللہ اسی سال سے شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیمی اسکیم پر مشتمل ایک دو ورقہ کانفرنس کے شرکاء میں تقسیم کیا گیا۔

ساڑھے آٹھ بجے صبح پہلے اجلاس کا آغاز ہوا جس کی صدارت قرآن اکیڈمی کے مولانا محمد حسین میر صاحب نے کی۔ اس اجلاس میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے ڈاکٹر عبد الغفار شکیل صاحب نے اپنا مقالہ "قرآن حکیم کی تدریس میں لسانیات کا دخل" پیش فرمایا۔ جناب پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے "قرآنِ حکیم اور مشاہیرِ عالم" کے عنوان پر اور ڈاکٹر الطاف جاوید صاحب نے "سُنّتِ رسولؐ" کے موضوع پر اپنے مقالات پڑھ کر سنائے۔ نصف گھنٹہ چائے کا وقفہ ہوا، جس کے بعد "علامہ اقبال مرحوم اور قرآنِ حکیم" کے موضوع پر دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ آج یوم اقبال کی وجہ سے دفاتر وغیرہ میں عام تعطیل تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے کانووکیشن ہال میں یوم اقبال پر منعقدہ تقریب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے آج صبح تقریر ارشاد فرمائی اور قرآن کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے شروع ہونے تک واپس قرآن اکیڈمی تشریف لے آئے۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری صاحب نے ایک نظم ترنم میں پڑھ کر سنائی۔ پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کا مقالہ "علامہ اقبال اور کتاب زندہ" آگیا تھا، لیکن سنایا نہ جا سکا۔ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے چوہدری مظفر حسین صاحب کا مقالہ "سائنس بطورِ تصوّف" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پڑھ کر سنایا، نیز درمیان میں وضاحتیں فرماتے رہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے تقریر ارشاد فرمائی اور اس طرح یہ دوسرا اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

حسبِ اعلان آج شام کو قرآن اکیڈمی ہی میں دو اضافی پروگرام منعقد ہوئے یعنی ① محفلِ سماع مسنون یعنی استماعِ قرأتِ قرآنِ حکیم جس کی صدارت قاری عبد القیوم صاحب نے کی۔ اس روح پرور اجتماع میں جن قرّاء حضرات نے حصّہ لیا

اُن کے نام حسب ذیل ہیں :
قاری محمد آصف، قاری محمد عارف، قاری محمد قاسم، قاری محمد احسان الحق
قاری محمد اسلم، قاری مراتب علی، قاری محمد ادریس اور ننھے قاری آصف حمید (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے) یہ وہی صاحبزادے ہیں جنھوں نے چند سال پہلے قرآن کانفرنس کے موقع پر کرسیٔ صدارت پر بالجبر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اس دفعہ بھی قرآن کانفرنس کے موقع پر ایک موقع ایسا آیا جب یہ حضرت کرسیٔ صدارت پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے نومولود بھانجے جناب منذر کے واسطے۔ لیکن ہائے جبکہ زسے نبٹنے کے لئے وہاں پہلے سے خاصے انتظامات کر لیے گئے تھے۔ اس لیے کرسیٔ صدارت اس بار محفوظ رہی ہاں! جناب قاری آصف حمید نے قرأت کے اجتماع میں اپنی ننھی منی قرأت سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ اسی پروگرام کا دوسرا جُز "حُسنِ بصارت" کے عنوان سے تھا۔ سراپا حسن۔ "حسنِ سماعت اور حُسنِ بصارت" یعنی حُسن ہی حسن۔ حُسنِ بصارت کے عنوان سے محکمۂ اطلاعات حکومتِ سندھ کی تیار کردہ سورۂ رحمٰن کے مناظر پر مشتمل فلم دکھائی گئی۔ قرآن مجید کے قدیم نسخوں پر مبنی حکومتِ سندھ کے محکمۂ اطلاعات کی تیار کردہ ایک نئی فلم "روشن حروف" بھی نمائش کے لئے لائی گئی تھی، اور اسے دکھانا شروع بھی کر دیا گیا تھا لیکن اس کی نمائش اس لیے بند کر دینی پڑی کہ ایک تو اس میں عورتوں کو قرآنِ حکیم پڑھتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے قرآنِ حکیم کے قدیم نسخے دکھاتے ہوئے اور اس پر کمنٹری پیش کرتے ہوئے پس منظر میں میوزک (MUSIC) کی دُھن بجائی گئی تھی۔ یہ چیزیں اس روح پرور اجتماع کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ قرآنِ حکیم کے پرانے نسخوں پر مشتمل یہ فلم کیا اِن لغویات کے بغیر تیار نہیں کی جا سکتی تھی؟ کیا عورتوں کو قرآنِ حکیم پڑھتے دکھانا ضروری تھا۔ سچ
— آہ! کہ بےچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار! —
مقدّس سے مقدّس محفل میں بھی بغیر عورت کی رُو نمائی کے بات نہیں بنتی — یہ ہمارے جذبات کے سفلہ پن کی ایک علامت ہے! — کیا قرآنِ حکیم کے قدیم نسخوں کی کمنٹری کے پس منظر میں میوزک کی دُھن ضروری تھی؟ — کیا کل کو قرآن

حکیم کی قرأت بھی آپ میوزک کی دُھن کے ساتھ سنائیں گے؟ بتوں سے ایسی ہی محبت ہے تو براہِ کرم بت خانہ تشریف لے جائیے، مسجد کو بتوں سے آلودہ نہ کیجئے
"بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی ؎ مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟"
"روشن حروف" فلم کی نمائش بند کئے دیر ہو چکی تھی مگر میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ اور میرے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گھوم رہا تھا ؎
آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے ؎ شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر
مگر ہائے افسوس! ہم اس شعر کو جھوم جھوم کر تو پڑھتے ہیں مگر عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ: "طاؤس و رباب اوّل، طاؤس و رباب آخر!"

قرآن کانفرنس ختم ہو چکی ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو رواں دواں ہیں۔ میں بھی اپنے ٹھکانے پر جا رہا ہوں۔ قرآن کی عظمت و اعجاز پر وعظ تو بہت سن لئے۔ مسائلِ حاضرہ کا حل قرآنِ حکیم کی روشنی میں — اس عنوان پر تقاریر اور مقالات تو بہت گوش گذار کر لئے — مگر عملاً میں کہاں ہوں؟ کیا میرے اندر قرآن کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا کوئی جذبہ پیدا ہوا؟ کاش! اے کاش! ایسا ہو جائے، تو میں سمجھوں کہ میرے گذرے ہوئے یہ چند دن اور راتیں میری زندگی کی متاعِ عزیز بن گئیں ؎

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا! وہ سب کہانیاں ہیں!

قبروں پر سنگِ مرمر کے شاندار مزار بنا ڈالو، اندر تو گلی سڑی ہڈیوں کے سوا کچھ نہ ملے گا، اور آج کیا ہم سب چلتی پھرتی قبریں نہیں ہیں؟

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا سالانہ اجلاس

۱۸ر تا ۲۱ر اپریل قرآن کانفرنس جاری رہی جس کے فوراً بعد یعنی ۲۲ر اپریل کی شام کو حسبِ اعلان قرآن اکیڈمی میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ یہ اجلاس ہر سال مارچ یا اپریل میں منعقد ہوتا ہے اور اس میں ہر دو سال کے بعد مجلسِ منتظمہ کے انتخابات ہوتے ہیں۔

اجلاس کی کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع کی گئی۔ تلاوت ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے کی۔

سب سے پہلے انجمن کے معتمد جناب چوہدری نصیر احمد ورک صاحب نے سالانہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی جس کی توثیق حاضرین اجلاس نے باتفاق رائے کی۔

میاں محمد رشید صاحب ناظم بیت المال نے سالانہ گوشوارہ مالیات برائے سال منتہیہ ۳۱ دسمبر ۷۹ء پیش کیا۔ یہ گوشوارہ حسب قواعد اندرونی (INTERNAL) اور بیرونی (EXTERNAL) آڈٹ کے بعد مرکزی ریونیو بورڈ کو بھیجا جا چکا ہے، جس کی توثیق بورڈ کی طرف سے کی جا چکی ہے۔ اجلاس عام نے ان حسابات کی منظوری دے دی۔

بعد ازاں صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حاضرین جلسہ سے مختصر خطاب فرمایا۔ انہوں نے وابستگان انجمن کے مسلسل تعاون کا شکریہ ادا کیا اور دروس قرآن کی ان مجالس کا خاص طور پر ذکر کیا جو بفضلہ تعالیٰ لاہور میں ہر ہفتہ چوبیس مقامات پر منعقد ہو رہی ہیں، اور جن میں ڈاکٹر صاحب کے تربیت یافتہ نوجوان درس دے رہے ہیں۔ صدر مؤسس نے نیپا (NIPA) کے زیر تربیت افسران کے اجتماعات میں اور جی۔او۔آر (سرکاری افسران کی رہائشی کالونی ۱) کی جامع مسجد میں ہفتہ وار درس قرآن حکیم کا خاص طور پر ذکر کیا جن کے ذریعہ دعوت کا دائرہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ میں بہتر طریق سے پہنچ رہا ہے اور یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ صدر مؤسس نے قرآن اکیڈمی کے آئندہ تعلیمی پروگرام اور دارالمقامہ کے قیام جن کے ذریعہ نئی پود کی رہنمائی اور تربیت ملحوظ خاطر ہے، کی طرف بھی اجمالاً روشنی ڈالی۔ آپ نے اپنے پچھلے سال کے امریکہ، کینیڈا اور مصر کے دوروں کا بھی ذکر کیا جن کے ذریعہ کام کی نئی راہیں کھلی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سال بھی ان شاء اللہ ماہ اگست میں بیرونی دورے پر جانے کا پروگرام ہے کیونکہ امریکہ اور کینیڈا سے شدت سے تقاضا ہو رہا ہے۔

بعد ازاں ملک محمد بشیر صاحب ناظم انتخابات نے خفیہ برائے شماری کے

ذریعہ مجلس منتظمہ کے حلقہ وار انتخاب کے طریق کی وضاحت فرمائی، اور انجمن کے وابستگان کے مختلف حلقوں نے دستور کے مطابق انتخابات میں حصّہ لیا۔

اس انتخاب کے بعد دُعا کے ساتھ اجلاس عام کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی اور احبابِ انجمن میں سے ایک صاحب کی جانب سے شرکائے اجلاس کی تواضع چائے وغیرہ سے کی گئی۔

● بقیہ ’تذکرہ و تبصرہ‘ صـ۶۴ـ سے آگے ●

میرے برملا اظہارِ اختلاف سے صرف انتشار ہی پیدا ہوگا، پروگرام میں کسی تبدیلی کا اب کوئی امکان نہیں ہے ـــــ اس لئے میں نے اپنے بارے میں اجلاس میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور سفر کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ ممکن ہے جن حضرات نے وہ فیصلے کئے جن سے مجھے اختلاف ہے ان کے پاس اس کی کچھ وجوہ ہوں جن پر وہ فیما بینہم وبین اللہ مطمئن ہوں۔ لیکن اس عاجز کا نقطۂ نظر وہی ہے جس کو ان سطروں میں عرض کیا گیا ہے : کل یعمل علیٰ شاکلتہ ؕ

گذشتہ دو تین ہفتوں میں اندرونِ ملک اور بعض بیرونی ممالک سے بھی راقم سطور کے پاس بکثرت خطوط آئے ہیں جن میں دارالعلوم اور جماعتِ دارالعلوم سے میرے تعلق کی بنیاد پر اجلاس سے متعلق مختلف قسم کے سوالات کئے گئے ہیں۔ بعض اخبارات و رسائل نے بھی اس سلسلہ میں مجھے مخاطب کیا ہے اور میرا موقف دریافت کیا ہے۔ بعض خطوط میں میری عدم شرکت کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا ہے۔ میں نے اِن خطوط و مراسلات کا الگ الگ جواب دینے کے بجائے ’الفرقان‘ میں یہ سطریں لکھ دینا مناسب سمجھا : وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (’الفرقان‘ مئی ۱۹۸۰ء)

مولانا نعمانی مدّظلہٗ کے دیوبند نہ آنے کا سبب وہاں یہ سننے میں آیا تھا کہ وہ علیل ہیں۔ اصل حقیقت اس تحریر سے سامنے آئی۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ بھی جمعہ کی رات کو اس وقت پہنچے جبکہ راقم رختِ سفر باندھ چکا تھا۔ اس وقت ان سے ملاقات کی کوشش یقیناً ہفت خواں طے کرنے کے مترادف ہوتی۔ لہٰذا راقم یہ حسرت بھی دل میں لئے

جنابُ م۔ ش، کا اعترافِ حقیقت

از قلم :- قاضی عبدالقادر

یہ رُبع صدی سے زیادہ کی بات ہے: "دو چار برس کی بات نہیں!"- میرا طالب علمی کا دور تھا اور میں اسلامی جمعیّت طلباء کا رکن تھا- جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہمارے ناظمِ اعلیٰ تھے- آج کی جمعیّت والے کیا جانیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی فعّال شخصیّت کا اثر تھا کہ پورے ملک میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً جمعیّت نے اُن کے دور ہی میں قدم جمائے اور ایک فعّال تنظیم کی حیثیّت سے اُبھری-

مجھے خوب یاد ہے کہ ان دنوں ہم "اقدام" اور "چٹان" بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے- ایک ہی نشست میں پورا پرچہ ختم کر لیا جاتا تھا اور اگلے پرچے کا انتظار رہتا تھا- "م- ش" صاحب سے ان کی تحریروں کے ذریعے یہ پہلا غائبانہ تعارف تھا-

دن گزرتے گئے- ایک بار لاہور میں جمعیّت کا سالانہ اجتماع منعقد ہو رہا تھا- ناظمِ اعلیٰ غالباً خُرّم جاہ مراد تھے- "م- ش" صاحب بھی عام اجلاس میں تشریف فرما تھے- ان کا ذہن کٹّر مسلم لیگی اور اجتماع جمعیّت کا جس کا تنظیمی نہ سہی فکری تعلق بہرحال جماعتِ اسلامی سے تھا- مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اجتماع کے دوران ہی اٹھ کر کسی بات پر تنقید شروع کر دی اور تابڑ توڑ ایسے سوالات کر ڈالے جن کی چبھن محسوس کی گئی- سوالات کیا تھے اور ان کے جوابات کیا دیئے گئے یہ تو یاد نہیں رہا، ہاں یہ یاد ہے کہ اجتماع میں کچھ بد مزگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت نوجوانی کے دور میں "جمعیتی عصبیّت" کی بنا پر میرے دل میں ان کے خلاف میل آ گیا تھا-

ملک کی سیاست نت نئی کروٹیں لیتی رہی- سیاست دانوں کی اکھاڑ پچھاڑ، اس کے نتیجے میں مارشل لاء، ایّوب خاں کا عرصہ تک کوسِ لمن الملک بجانا، پھر ان کا زوال، انتشار و خلفشار کا دور، یحییٰ خاں کا مارشل لاء اور پھر سنہ ۷۰ء کے عام

انتخابات اور ان کے لئے ایک طویل انتخابی مہم انتہا پسند (EXTREMIST) گروہوں کی منظرِ عام پر دھما چوکڑی، ذاتی، گروہی اور علاقائی عصبیتوں، رنجشوں اور کدورتوں کا ننگا ناچ اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ، نتیجۃً ملک کا دولخت ہو جانا۔ یہ تو کوئی دُور کی بات نہیں، ان سے تو ہر شخص واقف ہے۔

ذکر ہو رہا تھا "م۔ ش" صاحب کا، یحییٰ خان کے دور کے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں موصوف غالباً اوکاڑہ کی مرکزی نشست سے امیدوار تھے۔ مقابلہ میں دیگر حضرات کے علاوہ جماعت اسلامی کے نمائندے تھے ریٹائرڈ میجر جنرل امراؤ خان جنھیں اس زمانہ میں بعض اخبارات جماعت اسلامی کا ڈرل ماسٹر لکھتے تھے۔ "م۔ ش" کی ڈائری اس زمانہ میں "نوائے وقت" میں شائع ہوتی تھی جسے میں ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اپنی ڈائری میں ایک بار انہوں نے جنرل امراؤ خان پر کچھ چھینٹے اڑائے۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ کیا لکھا تھا۔ البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ اسے پڑھ کر مجھے تاؤ خاصا آیا تھا۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ طالب علمی کے دور کے بعد میں جماعت اسلامی کا کارکن بن گیا تھا، اور ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں جماعت کے دیگر کارکنوں کی طرح میں بھی پُرجوش طریقہ پر کام میں لگا ہوا تھا۔ اپنے حلقے کے انتخابی کام کے علاوہ کراچی کے مرکزی نظم کے شعبۂ نشر و اشاعت سے بھی اعزازی طور پر وابستہ تھا۔ میں نے "نوائے وقت" میں جب "م۔ ش" صاحب کی یہ تحریر پڑھی تو وہی پرانی عصبیت جو اب "جمعیتی" سے ترقی کر کے "جماعتی" بن چکی تھی، جاگ اٹھی۔ فوراً شدید ترین الفاظ میں ایک خط اُن کو لکھ مارا۔ میرے خط کا جو جواب انہوں نے دیا حقیقت یہ ہے کہ وہ میرے "جماعتی عصبیتی ذہن" پر بھرپور طمانچہ تھا۔ موصوف کا وہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، ملاحظہ فرمائیے اور ان کی عالی ظرفی کی داد دیجیے۔ اس لئے کہ اپنی غلطی کا برملا اعتراف اور وہ بھی لگے لپٹے نہیں بلکہ کھلے الفاظ میں ایک عالی ظرف انسان ہی کا کام ہوتا ہے۔

۸۰۔سی۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور۔
۲۵ر جون ۱۹۷۰ء

مکرّم بندہ! السلام علیکم

میں خلوصِ قلب سے اپنی غلط نگارش پر شرمندہ ہوں۔ دعا کریں

اللہ تعالیٰ اس لغزش پر مجھے معاف فرمائیں۔ دراصل یہ میری طرف سے
کمینگی کا مظاہرہ تھا۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی غلطی کا اعادہ
نہیں ہوگا۔ والسلام ـــــ خاکسار : "م۔ شے"

واقعہ یہ ہے کہ اس خط نے میرے ذہن پر جماعتی عصبیت کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے ضمن میں پہلے جھٹکے کا کام کیا۔ اس لئے کہ میرے سامنے یہ حقیقت شدت کے ساتھ اُبھر کر آئی کہ شرافت اور مروّت پر کسی حلقے کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ جنس اگرچہ کمیاب ہی نہیں تقریبًا نایاب کے درجے میں ہے تاہم جماعتی دائرے کے باہر بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جناب "م۔ شے" صاحب کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا ـــــ بعد میں جب مَیں نے یہ دیکھا کہ "شوکتِ اسلام" کے جلوسوں کے بڑے بڑے تعزیے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں دفن کر دیئے گئے تو آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا اور حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی۔ ہم کہاں سے چلے تھے ؟ ہم کدھر جا رہے ہیں ؟ بلکہ ہمیں کدھر لے جایا جا رہا ہے ؟ کیا یہ راستہ واقعی اسی منزل کی طرف جاتا ہے جو ہماری مقصود تھی ؟ ہم کہیں غلط موڑ تو نہیں مُڑ آتے ؟ یہ اور اسی طرح کے سوالات تھے جنہوں نے ذہن میں کلبلانا شروع کر دیا۔ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ ایک ہلچل مچا دی۔ کتنی ہی راتیں تھیں جو اسی سوچ میں جاگ جاگ کر گذاریں سے

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں :: کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

۱۹۷۲ء میں حج کے لئے رختِ سفر باندھا۔ حرم شریف میں ان سوالات پر بار بار سوچا اور ذہن کے اُفق پر جوابات آتے گئے، آتے گئے۔ یہاں تک کہ ذہن بالکل صاف ہو گیا، اور اس پر اطمینان ہو گیا کہ تحریک غلط موڑ مڑ گئی ہے اور ایک دلدل ہے جس میں پھنستی چلی جا رہی ہے۔ صحیح راستہ بھی نکھر کر سامنے آ گیا۔ ذہن اور قلب دونوں نے مل کر ایک فیصلہ کیا، واپس پاکستان آ کر اس فیصلہ پر فوری عمل کیا ـــ ایک طرف سے کٹ گیا اور دوسری طرف جڑ گیا۔ الحمد للہ کہ کوئی درمیانی عرصہ بے عملی کا نہیں گذرا ـــ اور یوں میرا تعلق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن سے قائم ہو گیا اور الحمد للہ اسی راستے پر گامزن ہوں۔

آدمی سلیم الفطرت ہو اور حقیقت کو پا جائے تو وہ ایک لمحہ بھی اس کا اعتراف کرنے اور اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ کچھ یہی حال ہمارے "م۔ شے"

صاحب کا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے ادراک پر کہ : "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" کے لئے فی الوقت "کرنے کا اصل کام" وہی ہے جو "مرکزی انجمن خدام القرآن" لاہور کے صدر مؤسس اور "تنظیم اسلامی" کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کر رہے ہیں، وہ عمر، تجربے اور بہت سے دوسرے اعتبارات سے ان سے بدرجہا فائق ہونے کے باوجود اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کا نذرانۂ خلوص کی طشتری میں سجا کر ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے درجِ ذیل خط سے لگائیے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴۔ بابر بلاک۔ نیو گارڈن ٹاؤن۔ لاہور ۱۹ر اپریل سنہ ۸۰ء

مکرم و معظم جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ !

آپ ہم سب کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہیں بلکہ عطیۂ خداوندی ہیں۔ آپ جس دردمندی، لگن اور تسلسل سے اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہوگا۔ میں اپنی تمام خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حضور آنسو بھری آنکھوں سے یہ دُعا کرتا ہوں کہ اے مالکِ کون و مکان ! اپنے اس مخلص بندے کی مساعی کو جو وہ تیرے کلام کی خدمت کے سلسلہ میں انجام دے رہا ہے، مشکور فرما۔ آمین اللّٰھم آمین ــــ !!

خدا نے ایک وقت قائداعظم اور علامہ اقبال کی حیات میں ایک حقیر کارکن کی حیثیت میں ان دو عظیم انسانوں کے مشن کے لیے کام کرنے کی توفیق ارزاں فرمائی تھی۔ بساط بھر زندگی کے مختلف مراحل میں اپنا کردار ادا کرنے کی حقیر کوشش کرتا رہا ہوں۔ اب میں اپنی زندگی آپ کے قدموں میں بسر کرنے کی تڑپ رکھتا ہوں...... آپ کو اُفق پر ایک ستارے کی طرح چمکتا دیکھ کر دل میں امید پیدا ہوتی ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو ــ والسلام

ـــــــــــــ خاکسار : محمد شفیع (م۔ش)

نوٹ : کل جمعہ کی نماز آپ کی اقتدا میں ادا کی۔ قرأت پہ دل جھوم جھوم اُٹھا۔"

• مزید برآں پچھلے دنوں ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر میرا لاہور آنا ہوا۔ ۱۸ر تا ۲۱ر اپریل کانفرنس جاری رہی۔ ۲۳ر اپریل کو جناح (ٹاؤن) ہال میں امیرِ تنظیمِ اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ایک بڑے جلسۂ عام میں "اسلام کا پیغام مسلمانانِ پاکستان کے نام" کے موضوع پر ایک فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ اس تقریر کا تذکرہ جناب "م۔ ش" صاحب نے اپنے کالم میں (روزنامہ مشرق ۲۷ر اپریل ۸۰ء) جس انداز سے فرمایا ہے اس پر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ قلب کی گہرائی سے ان کے لئے دعائیں نکلیں۔ قارئین کرام! کیوں نہ آپ بھی اس تاریخی کالم کو ملاحظہ فرمائیں۔

○ "م۔ ش" کا کالم ○

"ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک!"

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند ❊ اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

ایک دن میں حضرت علامہ اقبال کا مندرجہ بالا شعر پڑھ کر ان سے پوچھا کہ آیا اس تین سو سالہ ریفرنس سے اُن کی مراد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شخصیت سے ہے تو انہوں نے فرمایا: "نہیں میری مراد اس سے مجدّد الفِ ثانی سے ہے!"

جمعرات کی شام کو ٹاؤن ہال لاہور میں بیٹھے ہوئے مجھے یہ واقعہ اس وقت معاً یاد آیا جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تقریر میں جس کی اُڑان میں مجدّد الفِ ثانیؒ سے لے کر دورِ حاضرہ کی تمام قابل شخصیات سمٹ آئی تھیں تنظیم اسلامی کے عنوان پر علوم و معارف کے دریا بہا رہے تھے۔ کم و بیش تین گھنٹے کی اس تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بلا لومۃ لائم احیائے دین کے لئے برِّصغیر کی تحریکوں پر عموماً اور پاکستان میں خصوصاً جس بے ساختگی، گھن گرج، تڑپ اور جوش سے تبصرہ کیا، اس پر اقبال کا یہ مصرع میرے شعور کی پہنائیوں میں دھڑکن پیدا کرتا رہا ع: "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک!"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مجدّد الفِ ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی تک احیائے دین

کے لئے ان سے متعلق تمام دھاروں کو نقطۂ عروج پر لاتے ہوئے آج پاکستان میں غلبہ اور اقامتِ دین کے لئے تاریخی لحاظ سے ہر ایک شخص کو کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب اُمّت کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور چونکہ وہ طب کے ڈگری یافتہ بھی ہیں، اس لئے انہوں نے مامور یّت کے مقام سے نہیں بلکہ ایک مُناد کی حیثیّت میں ہر شخص کو بقدرِ استطاعت اس مہتم بالشّان مہم یعنی تحریک اقامتِ دین میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے ہر سننے والے پر یہ تأثّر راسخ کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کو خدا کے منشاء کے مطابق تمام ادیان پر غالب کرنے کے لئے جس میں دُنیا کی بھلائی ہے۔ پاکستان کے ایک ایک مسلمان کو فرقہ بندی سے الگ رہ کر قرآن کی تعلیم کو اپنی زندگی کا نمونہ بنانا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس احساس سے سرشار لوگ ایک نظام میں منسلک ہو کر اپنے آپ کو قرآن کی تعلیم اور اس کی تبلیغ کے لئے وقف کردیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نہ تو واعظ ہیں اور نہ ہی وہ "کمرشل" ہیں بلکہ وہ ایک ایسے انسان ہیں جنھوں نے دُنیا کی متاع پر لات مار کر اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اپنے دل سے ایک فیصلہ کر رکھا ہے۔ وہ اس دھن میں مست دن رات، صبح و شام، سردی اور گرمی، آرام اور بے آرامی، تحسین اور تردید سب کچھ سے بے نیاز ہو کر قرآن کے نور کو ہر سطح پر پھیلانے میں مصروف ہیں — انہیں اپنی علمیّت پر کوئی ناز نہیں۔ انہیں کسی قسم کی ٹھیکے داری اور اجارہ داری سے غرض نہیں۔ وہ اپنے جنون، اپنے عشق اور وارفتگی میں اُمّت کے تمام طبقوں اور فرقوں کو قرآن عظیم کے پیغام پر متّحد اور مستفیض ہونے کے لئے کام کئے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کا جو اس مقصد سے لگاؤ رکھتا ہو، کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اُن کا لباس، اُن کی خوراک اور اُن کی رہائش ویسی ہی ہے جیسی کہ پاکستان کے کسی متوسط درجے کے فرد کو حاصل ہو۔ ان کی آواز میں اثر ہے، ان کی شخصیّت میں کشش ہے، ان کی آنکھوں میں چمک ہے، وہ جناح ہال میں تین گھنٹے تک بلا تکان، بلا تکلّف اپنی کہتے چلے گئے۔ نہ تو ان کا گلا بیٹھا اور نہ اُن پر تھکان کے کوئی آثار نمودار ہوئے اور جب جلسے کے اختتام پر انہوں نے نمازِ عشاء میں امامت کرتے ہوئے قرأت کی تو مقتدیوں کی آنکھوں

سے بے اختیار آلنسوٹپک پڑے۔

ہمیں یہ احساس نہیں کہ یورپ اور امریکہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ وہاں پوپ سے لے کر ملی گراہم تک لاکھوں کی تعداد میں عیسائی مبلغین اپنے آپ کو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے وقف کر چکے ہیں کہنے کو تو یورپ اور امریکہ سیکولر ہیں لیکن اس سیکولرزم کے پردے میں مغربی ممالک کی حکومتیں تثلیث کی اشاعت کے لئے مسلمانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے حیرت انگیز نظام مرتب کر لیا۔ اگر ہم فی الحال اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے فرقہ واریت کو دفن نہیں کر سکتے تو ہمیں کم از کم رواداری سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو اپنی اپنی صوابدید اور ذرائع کے مطابق اپنے اپنے میدان میں کام کرنے کی دل سے اجازت دینا چاہیئے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس ضرورت کی جیتی جاگتی تعبیر اور تفسیر ہیں ان کے نمونہ پر اگر کام کیا جائے تو مسلم معاشرہ فرقہ واریت کی لعنتوں سے محفوظ ہو سکتا ہے ٭

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

اور اس میں انار کا وہ پودا جس کے سائے میں تدریس کا آغاز ہوا تھا، اور دوسری جانب دار العلوم کی موجودہ شاندار عمارت، ایک طرف مولانا حسین احمد مدنیؒ کا پرانا بوسیدہ مکان — اور دوسری جانب مولانا اسعد مدنی با تقابہ کی موجودہ قلعہ نما حویلی، مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی چھوٹی سی مسجد اور اس کے سامنے ان کا پرانا مکان — اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی رہائش گاہ اور وہ بیٹھک جس میں اکھاڑا بھی تھا جہاں مولانا 'زور' کیا کرتے تھے — الغرض لگ بھگ ایک صدی کی تاریخ اور ماضی حال اور قدیم و جدید کے تضادات —!!

سب سے بڑا "تضاد" شام کو اجتماع گاہ اور جلسۂ عام اور مہمانوں کے قیام کے لئے تیار شدہ پنڈالوں کو دیکھ کر سامنے آیا۔ وسیع و عریض رقبہ، نہایت سلیقے سے تیار شدہ نقشہ، بجلی کے سینکڑوں کھمبے اور ان پر تاروں کا بھاری بھرکم جال، کئی ٹیوب ویل اور سینکڑوں ہینڈ پمپ اور بے شمار کچی اور پکی نالیاں جن میں پانی رواں۔ بجلی کے ہزارہا بلب اور ٹیوبیں — نتیجۃً پورا علاقہ بقعۂ نور — ذہن میں سوال پیدا ہوا، کہاں یہ نظم و ضبط اور حسن انتظام ہی نہیں زیبائش و آرائش کا منظر اور

کہاں وہ بدنظمی جس کا مشاہدہ صبح سے ہو رہا تھا!!— دماغ کے کمپیوٹر نے جواب فوراً حاضر کر دیا— وہ کارکنوں کی اپنی کارکردگی تھی— اور یہ پیسے کا کھیل ہے، ستر اسی لاکھ روپے کا ٹھیکہ دیا اور فراغت ہوئی۔ اب ساری ذمہ داری ٹھیکیدار کی یا اس کے مزدوروں اور مستریوں کی!!— اپنے نہ جسم پہ کوئی مشقت نہ جان پہ کوئی کوفت—!!!

ہم جمعرات کی صبح دیوبند پہنچے تھے اور "جشن" کا آغاز جمعہ کے روز نماز جمعہ سے ہوتا تھا۔ جمعرات کی شام ہی کو ہجوم کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم کے آس پاس دیوبند کے بازاروں اور گلیوں میں چلنا مشکل ہو گیا اور کھانے وغیرہ کے لئے بازار آنے جانے کے لئے باقاعدہ سوچنا اور ہمت کو مجتمع کرنا پڑتا تھا۔ جمعہ کی صبح سے تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ راقم کا گمان یہ ہے کہ مغربی یوپی کے اضلاع مظفر نگر اور سہارنپور کا تو شاید کوئی بھی مسلمان ایسا نہ رہا ہو جو اس اجتماع میں نہ آگیا ہو۔ اس کے علاوہ آس پاس کے اضلاع یہاں تک کہ میوات کے علاقے کی آبادی کا بھی بیشتر حصہ دیوبند آگیا تھا— جمعہ کے لئے پہنچے تو اس جلسہ گاہ کے تو قریب پھٹکنے تک کا کوئی امکان نہ تھا جسے گذشتہ شام ہم نے دیکھا تھا تو اس کی وسعت پہ دنگ رہ گئے تھے کہ اس کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر دوسرا سرا کم از کم راقم کو صاف نظر نہ آتا تھا اور اب نہ صرف یہ کہ وہ پُر ہو چکا تھا بلکہ اُس کے اطراف میں دُور دُور تک انسان ہی انسان نظر آرہے تھے— نمازِ جمعہ تک تو الحمدللہ کہ لوگ پُرسکون بھی رہے اور منضبط بھی— قاری محمد طیب مدظلہٗ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور نماز پڑھائی اور یہ پورا مرحلہ سکون و اطمینان سے طے پا گیا۔ لیکن اس کے بعد جب جلسہ کا آغاز ہوا تو جو ہڑبونگ شروع ہوئی اور شور و غوغا بپا ہوا اس میں کارروائی کا آغاز مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ قاری عبدالباسط صاحب کی قراءت بھی اس شور اور ہنگامے کو فرو نہ کر سکی— بلکہ خود ہی دب کر رہ گئی۔ قاری محمد طیب صاحب کی تقریر اور زعمائے ملتِ اسلامی کے وعظ نما پیغامات کے دوران بھی شور اور ہنگامہ اسی طرح جاری رہا— ہم تو سٹیج سے اتنے فاصلے پہ تھے کہ وہاں صرف کچھ سائے ہی سے حرکت کرتے نظر آتے تھے، پہچاننا کسی کو ممکن نہ تھا— واحد رابطہ لاؤڈ سپیکروں کی آواز کا تھا— اور اس سے اکثر و بیشتر خاموشی اور نظم و ضبط کے

تلقین ہی سننے میں آرہی تھی ـــــ اسی ہنگامے میں مسز اندرا گاندھی کی تقریر کا اعلان ہوا ـــ چند منٹ کی تقریر کے دوران ذرا سکون سا رہا اور انہوں نے جو کچھ کہا اس کا متن بھی سمجھ میں آگیا اور 'بین السطور' بھی مخفی نہ رہا ـ لیکن پھر اچانک کم از کم راقم کے اعصاب کے اعتبار سے ایک بم پھٹا ـــــ !! یعنی "مسز اندرا گاندھی زندہ باد" کا وہ نعرہ جو میٹنگ سیکرٹری صاحب نے بنفس نفیس لگوایا جو راقم کی معلومات کی حد تک مولانا سالم خلف الرشید قاری محمد طیب صاحب تھے (واللہ اعلم !) قال اللہ قال الرسول کے عظیم مرکز دار العلوم دیوبند کا اجلاسِ صد سالہ ـــ اور اس میں اُس کافرہ و ملحدہ عورت کے لئے 'زندہ باد' کا نعرہ جس نے نو سال قبل سقوط ڈھاکہ کو "ہزار سالہ شکست کا بدلہ !" قرار دیا تھا "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است !"

بہر حال راقم کے لئے یہ بات قطعاً ناقابلِ برداشت تھی، لہٰذا اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ مزید قیام نہ کرے بلکہ فوراً واپسی کا سفر اختیار کرے گا۔ چنانچہ اسی رات تقریباً گیارہ بجے دیوبند سے روانہ ہو کر ہفتہ ۲۲ مارچ کو دوپہر کے لگ بھگ راقم واپس اپنے مستقر پر پہنچ گیا۔

مسز اندرا گاندھی کی اس اجلاس میں شرکت کا ذکر سب سے پہلے جمعرات کی صبح کو دیوبند ریلوے اسٹیشن پر سننے میں آیا تھا، لیکن وہ اس طور سے کہ جیسے وہ زبردستی آرہی ہوں۔ پھر دن میں ایسی باتیں سننے میں آئیں جن سے ایک سوئے ظن مولانا اسعد مدنی سے پیدا ہوا کہ شاید یہ سب ان کی 'کارستانی' ہے ـ لیکن میٹنگ سیکرٹری صاحب کی جانب سے اس نعرے سے بات کچھ اور ہی سامنے آئی اور بعد میں بعض دوسرے ذرائع سے جو رازہائے درونِ پردہ سامنے آئے وہ تو اتنے ناگفتہ بہ ہیں کہ دار العلوم دیوبند اور اُس کے مؤسسین و اکابر سے محبت و عقیدت رکھنے والا کوئی شخص سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

"گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے ❊ کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری"

اِدھر یہ سطور سپردِ قلم ہو رہی تھیں اور ادھر لکھنؤ سے ماہنامہ 'الفرقان' کا تازہ شمارہ آپہنچا ـــ اس 'حادثۂ فاجعہ' پر جو کچھ دار العلوم کے ایک قدیم خادم اور وفادار وکیل مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی کے قلم سے نکلا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمالیں :

"مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
دگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد!"

'الفرقان' کے فروری و مارچ کے مشترکہ شمارے میں جو اجلاس سے قریباً ایک ہفتہ پہلے شائع ہوا تھا، اسی عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اپنے دینی انحطاط' دارالعلوم کے موجودہ حالات اور زمانہ کی رفتار سے کچھ خطرات محسوس کرتے ہوئے لکھا گیا تھا، لیکن جو وقوع میں آیا اس نے بتلایا کہ ہم اس سطح سے بہت نیچے گر چکے ہیں جس کا خطرہ تھا۔

اس عاجز کا دین و دنیا کا سارا سرمایہ بس وہ تھوڑا سا (بہت تھوڑا سا) علم ہی ہے جو از اوّل تا آخر دارالعلوم ہی کا صدقہ ہے ——— اس مادرِ علمی کا باقاعدہ طالب علم بن کر تو اب سے قریباً ۵۵ سال پہلے صرف آخری دو درجوں کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس سے پہلے بھی جو کچھ کہیں پڑھا، دارالعلوم کے بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض یا بالواسطہ فیض یافتہ اساتذہ ہی سے پڑھا۔ اس طرح جو کچھ پایا اس کا سرچشمہ دارالعلوم ہی ہے ——— اس کے علاوہ دارالعلوم اور مسلکِ دارالعلوم سے ایک اختصاصی تعلق یہ بھی رہا کہ مختلف میدانوں میں اس کی نمائندگی اور وکالت و ترجمانی کا شرف بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اور اس بارے میں اپنے اکابر مرحومین کا پورا اعتماد نصیب رہا۔ ولا فخر ——!!

ایک ضابطہ کا اور کسی درجہ میں ذمّہ داری کا تعلق یہ بھی رہا کہ یہ عاجز قریباً چالیس سال سے اس کی مجلسِ شوریٰ کا رکن چلا آرہا ہے —!!!

اِن سب تعلّقات کا تقاضا اور حق تھا کہ میں اجلاس میں نہ صرف شریک ہوتا بلکہ اُس میں میرا نمایاں حصّہ ہوتا۔ اجلاس کے بہت پہلے سے میں مختلف ممالک کے دوستوں کے خطوط کے جواب میں لکھتا رہا تھا کہ اِن شاء اللہ العزیز دارالعلوم دیوبند کے اجلاس میں ملاقات ہوگی — پھر جب تاریخ قریب آنے لگی تو ریزرویشن بھی کرا لیا، لیکن صرف تین دن پہلے (جس دن مجھے دیوبند کے لئے روانہ ہونا تھا) اطلاع ملی کہ اجلاس کے منتظمین اور ذمّہ دار حضرات نے اجلاس کے پروگرام کے سلسلہ میں (کسی مجبوری سے یا اپنے نزدیک صحیح مناسب سمجھ کر) بعض ایسے فیصلے کر لئے ہیں جن سے بہرحال مجھے شدید اختلاف ہے اور دارالعلوم دیوبند جیسے مقدّس روایات رکھنے والے علومِ نبوی اور ہدایت و ارشاد کے کسی مرکز کے لئے میرے نزدیک ایسی کسی بات کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ اطلاع ملنے کے بعد میں غور و فکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اب وہاں پہنچ کر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

کا کراچی سب آفس

● مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے کراچی سب آفس کے اعزازی ناظم قاضی عبدالقادر صاحب کی لاہور منتقلی کی وجہ سے انجمن کی مجلس منتظمہ نے پچھلے ماہ کے اجلاس میں جناب عبدالواحد عاصم صاحب کو کراچی سب آفس کا اعزازی ناظم مقرر کیا ہے ۔ وہ کراچی میں انجمن کے مکتبہ ، دفتر ، املاک اور دیگر امور کے نگران اور ذمہ دار ہوں گے ۔ ان سے رابطہ انجمن کے سب آفس کے علاوہ حسب ذیل پتہ پر قائم کیا جا سکتا ہے :

شائننگ ٹریڈرز ، نزد کارخانہ تجارت کتب بالمقابل آرام باغ، فریئر روڈ، کراچی ۔ ٹیلیفون ، دکان ۲۱۴۷۰۹ ، مکان ۴۳۴۸۸۸ ۔

● قارئین کرام کے علم میں ہوگا کہ انجمن نے اب سے کوئی تین سال قبل کراچی کے مرکزی مقام میکلوڈ روڈ کے متوازی مولانا حسرت موہانی روڈ پر نئی تعمیر شدہ عمارت سنی پلازہ میں اپنے سب آفس کے لیے ایک کمرہ مالکانہ حقوق کی بنیاد پر پچاس ہزار روپے میں خریدا تھا ۔ اس کا قبضہ ملتے ہی وہاں پر کام کا آغاز ہوگیا تھا اور اب یہ دفتر ہی کراچی میں انجمن کی تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز ہے ۔ کام کی توسیع کی وجہ سے اجتماعات وغیرہ کے لیے یہ دفتر ناکافی ثابت ہو رہا ہے ۔ خوش قسمتی سے ملحقہ کمرہ کے مالک نے اسے فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انجمن کے کراچی کے ارکان نے موقع غنیمت جان کر انہتر ہزار میں اس کا سودا کر لیا ۔ اب کراچی کے وابستگان انجمن ، اہل خیر حضرات سے اس خطیر رقم کو جمع کرنے کی تگ ودو میں لگے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ قارئین 'میثاق' میں سے جو حضرات اس سلسلہ میں تعاون کرنا چاہیں وہ کراچی کی انجمن کے ارکان یا عبدالواحد عاصم صاحب سے رابطہ قائم فرمائیں جن کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر اوپر دیا جا چکا ہے !

المعلن : محمد بشیر ملک ، ناظم اعلی
مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

Regd. L. No. 7360

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 29 | JUNE 1980 | No. 6

تصانیف امام حمید الدین فراہیؒ

—(۱)—

مجموعہ تفاسیر فراہیؒ

● سائز : ۲۲×۲۹/۸ ● اعلیٰ آفسٹ پیپر صفحات : ۵۳۶

● سنہری ڈائی والی عمدہ جلد ● ہدیہ : -/۴۰ (محصول ڈاک علاوہ)

—(۲)—

اقسام القرآن

● بڑا سائز ● سفید کاغذ ● صفحات ۶۴ ● غیر مجلد

● ہدیہ : ۳/۷۵

—(۳)—

ذبیح کون ہے ؟

● بڑا سائز ● سفید کاغذ ● صفحات ۸۸ ● غیر مجلد

● ہدیہ : ۴/۵۰

(اقسام القرآن اور ذبیح کون ہے ؟ دونوں بیک وقت طلب کرنے پر محصول ڈاک معاف !)

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ، لاہور

ملنے کا پتہ : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور (فون : 852611)